جميع الحقوق محفوظة بحقّ المؤلّف

اسم الكتاب : ....

نماز کا مسنون طریقہ اور اس کے احکام و مسائل

تأليف : ....

فضيلة الشيخ رضآء الله الباجوري

الطبع : ....

....

الثانى سنة ١۴۴۶هـ

النّاشر : ..... مدرسة ترتيل القرآن شانرے باجور باكستان

حرفِ آغاز

تمام تر حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندوں پر نماز فرض کی، اسے قائم کرنے اور اچھے طریقے سے ادا کرنے کا حکم دیا، اس کی قبولیت کو خشوع و خضوع پر موقوف ٹھہرایا، اسے ایمان اور کفر کے درمیان فرق و امتیاز کی علامت اور بے حیائی اور برے کاموں سے روکنے کا ذریعہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام ہو، جنھیں اللہ تعالیٰ نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾

"اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لیے نازل کیا گیا ہے آپ اسے کھول کر بیان کر دیں۔"[1]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور جو شریعت آپ پر نازل ہوئی، آپ نے اسے پوری طرح روشن کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، تاہم نماز کی اہمیت کے پیش نظر اسے نسبتاً زیادہ واضح شکل میں اُجاگر کیا اور اپنے قول و عمل سے اس کا عام پرچار کیا یہاں تک کہ ایک بار نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر نماز کی امامت فرمائی، قیام اور رکوع منبر پر کیا، نیچے اتر کر سجدہ کیا، پھر منبر پر چڑھ گئے اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا:

إنَّما صَنَعْتُ هذا لِتَأْتَمُّوابی ولِتَعَلَّمُوا صَلاتِي

"میں نے یہ کام اس لیے کیا ہے تاکہ تم (نماز ادا کرنے میں) میری اقتدا کر سکو اور میری نماز (کی کیفیت) معلوم کر سکو۔" [2]

نیز اس سے بھی زیادہ زور دار الفاظ میں اپنی اقتدا کو واجب قرار دیتے ہوئے فرمایا:

[1]النحل 44:16 [2] صحيح البخاري، الجمعة، حديث: 917، وصحيح مسلم، المساجد، حديث: 544

((صلُّوا كما رأيتُموني أصلِّي))

"تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" [1]

مزید فرمایا: ((خمسُ صلواتٍ افترضَهُنَّ اللَّهُ من أحسنَ وضوءَهُنَّ وصلّاهنَّ لوقتِهِنَّ وأتمَّ ركوعَهُنَّ وسجودهن وخشوعَهُنَّ كانَ لَهُ عند اللَّهِ عَهْدٌ أن يغفرَ لَهُ، ومن لم يفعل فليسَ على اللَّهِ عَهْدٌ، إن شاءَ غفرَ لَهُ وإن شاءَ عذَّبَهُ)) "اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں جو شخص ان کے لیے اچھی طرح وضو کرے، انھیں وقت پر ادا کرے اور ان میں مکمل صحیح رکوع

کرے اور خشوع کا اہتمام کرے تو اس انسان کا اللہ پر ذمہ ہے کہ اسے معاف کر دے اور جو شخص ان باتوں کو ملحوظ نہ رکھے گا اس کا اللہ پر کوئی ذمہ نہیں، چاہے تو اسے معاف کرے اور چاہے تو عذاب دے۔" [2]

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے ساتھ اہل بیت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی درود و سلام ہو، جو نیکو کار اور پرہیز گار تھے۔ جنھوں نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت، نماز، اقوال اور افعال نقل کر کے امت تک پہنچائے اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ارشادات و مواعظ کو دین اور قابل اطاعت قرار دیا، نیز ان نیک انسانوں پر بھی درود و سلام ہو جو ان کے نقش قدم پر چلتے رہے اور جو آئندہ چلتے رہیں گے۔

امابعد! اسلام میں نماز کا اہم مرتبہ ہے، جو شخص اسے قائم کرتا ہے اور اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا وہ اجر و ثواب اور فضیلت و اکرام کا مستحق ہوتا ہے۔ پھر اجر و ثواب میں کمی بیشی کا معیار یہ ہے کہ جس قدر کسی انسان کی نماز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے زیادہ قریب ہو گی اسی قدر وہ زیادہ اجر و ثواب کا حقدار ہو گا اور جس قدر اس کی نماز نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے مختلف ہو گی اسی قدر کم اجر و ثواب حاصل کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إنَّ الرَّجلَ لينصَرِفُ وما كُتِبَ لَهُ إلّا عُشرُ صلاتِهِ تُسعُها ثُمنُها سُبعُها سُدسُها خُمسُها رُبعُها ثُلثُها نِصفُها))

[1]صحيح البخاري، الأذان، حديث: 631 [2] [صحيح] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 425، وسنده صحيح

"بے شک انسان نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے نامۂ اعمال میں اس (نماز) کا دسواں، نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا، تیسرا یا نصف حصہ لکھا جاتا ہے۔" [1]

"ہمارے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند نماز ادا کرنا اس وقت ممکن ہے جب ہمیں پوری تفصیل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت معلوم ہو اور ہمیں نماز کے واجبات، آداب، ہیئت، دعاؤں اور اذکار کا علم ہو، پھر اس کے مطابق نماز ادا کرنے کی کوشش بھی کریں تو ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ پھر ہماری نماز بھی ایسی ہو گی جو بے حیائی اور منکر باتوں سے روکتی ہے اور ہمارے نامۂ اعمال میں وہ اجر و ثواب لکھا جائے گا جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔" [2]

تنبیہ: عرض ہے کہ واجبات و آداب وغیرہ کا علم ہونا ضروری نہیں بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ خود تحقیق کر کے یا کسی مستند اور صحیح العقیدہ عالم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا علم حاصل کیا جائے اور پھر سنت کے مطابق نماز پڑھی جائے۔

نماز کی قبولیت کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات و صفات میں یکتا مانا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ اللہ کی بیوی ہے، نہ اولاد۔

کوئی اللہ کے نور کا ٹکڑا "نور من نور اللہ" نہیں ہے۔ اللہ کے کسی انسان میں اتر آنے کا عقیدہ، حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کھلم کھلا شرک ہے۔ یہ بھی مانا جائے کہ کائنات کے تمام امور صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہیں۔ عزت و ذلت اسی کے پاس ہے۔ ہر نیک و بد کا وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں کسی عمل کی قبولیت کا انحصار بالترتیب تین چیزوں پر ہے:

1. عقیدے کی درستی 2. نیت کی درستی 3. عمل کی درستی۔ ان میں سے کسی ایک میں خلل واقع ہونے سے سارا عمل مردود ہو جاتا ہے۔ اور یاد رہے کہ کتاب اللہ، سنت ثابتہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجموعی طرز عمل اور اجماع امت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی

] [1]حسن] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 796، بعد الحديث: 789- [2] صفة صلاة النبي ﷺ ، ص: 36، مطبوعة مكتبة المعارف -

عقیدے یا عمل کی صحت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ الحمد للہ اس کتاب کی ترتیب میں کوشش کی گئی ہے کہ صحیح احادیث سے مدد لی جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

ابو عطاء المنعم رضاء اللہ بن الحاج خان بادشاہ حفظہ اللہ ورعاہ وجعل الجنۃ مثواہ

22ذوالحجۃ -1446ھ -بمطابق:18جون---2025

یوم الاربعاء وقت:4--30ظہر

نماز کا مسنون طریقہ

اور

اس کے احکام و مسائل

اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے اقرارِ توحید و رسالت کے بعد نماز سب سے اہم رکن اور دین کا ستون ہے۔

نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہماری نماز:

جس طرح دیگر تمام نیک اعمال کے لیے دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ ایک شرط سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کام کی مطابقت و موافقت بھی ہے، اسی طرح نماز کی قبولیت کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں صرف وہی نماز شرفِ قبولیت سے نوازی جائے گی، جو بعینہٖ اُس طرح ادا کی گئی ہو، جس طرح ادا کر کے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھلائی۔[1] اور اسی کا حکم بھی فرمایا، جیسا کہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ)) [2]

"تم بعینہٖ اسی طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔"

[1]تفصیل کے لیے ہماری کتاب "قبولیتِ عمل کی شرائط" میں شرطِ سوم ملاحظہ فرمائیں۔ [2] صحيح بخاري مع الفتح (٢/ ١١١) مسلم مع النوي (٣/ ٥/ ١٧٤)

اس ارشادِ گرامی سے معلوم ہوا کہ ہماری نماز کی قولی و فعلی ہیئت و حالت ہو بہو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے نمونے کے مطابق ہونی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے ہماری نمازیں جتنی زیادہ مطابقت و مماثلت رکھیں گی، انھیں دربارِ الٰہی میں اتنا ہی زیادہ شرفِ قبولیت بھی ملے گا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہمیں تمام احکامِ قرآن کی تفسیر و تشریح اپنے قول و فعل یا عملِ مبارک اور ارشاداتِ گرامی کی شکل میں عطا فرمائی ہے، وہیں نماز کا حکمِ الٰہی بھی ہمیں قولی و عملی شکل میں بہم پہنچایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر: ٧]

"اور جو کچھ رسول تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرو! بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔" اس آیتِ شریفہ میں مذکور حکمِ الٰہی کے مطابق ہم پر اللہ کی فرض کردہ نماز بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے مسنون طریقے کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ ﴾ [النساء: ٨٠]

''جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔''

اس ارشادِ گرامی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ''حکمِ الٰہی کی تعمیل صرف اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ہی میں ممکن ہے۔'' جس طرح سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عمل میں لایا گیا کوئی نیک کام قابلِ قبول نہیں، اسی طرح نماز بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے، سکھلائے ہوئے اور کر کے دکھلائے ہوئے طریقہ کے خلاف پڑھی جائے تو قبول نہیں ہوتی۔ اور حق تو یہ ہے کہ صرف نماز پر ہی کیا بس ہے، خلافِ پیغمبر چلنے والا کوئی شخص کبھی بھی منزلِ مقصود اور گوہر مطلوب کو نہیں پا سکتا۔ اسی نکتہ کو شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب انداز سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

محال است سعدی کہ راہِ صفا

تواں رفت جز در پئے مصطفی (صلی اللہ علیہ وسلم)

مگر اس کے برعکس ہماری نمازوں کا عالَم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی یہ زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا طریقہ بتایا ہے، وہ پڑھیں اور سیکھیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز سے متعلقہ ارشادات کا بچشمِ خود مطالعہ کر کے اپنی نمازوں کا ان سے موازنہ کریں۔ بلکہ ہمارا سارے کا سارا انحصار اپنے ماں باپ اور پھوپھی دادی کی نمازوں کی نقل اتارنے پر ہوتا ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں یا پڑھتے تھے، ویسے ہی ہم بھی مشینی سے انداز کے ساتھ نشست و برخاست پر مبنی چند حرکات و سکنات اور کچھ قراءت و تلاوت اور ذکر و دعا کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اقامتِ صلاۃ یا ادائے نماز کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب آپ خود ہی فرمائیں کہ اسے کیا نام دیا جائے، نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا نمازِ آبائی، اور شاید دوسرا نام ہی ٹھیک بیٹھتا ہے، کیوں کہ ہم اپنے آبائی طریقۂ نماز کو اختیار کرتے ہیں۔ نماز کے بارے میں ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کر کے علیٰ وجہ البصیرت مسنون نماز نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اہتمام خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ اور ہوتا کیا ہے کہ اپنی ہی مرضی سے سنتوں کا

خیال رکھے بغیر جھٹ پٹ وضو کیا، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ اعضائے وضو کو گیلا کیا، کچھ اپنی طرف سے اضافے کیے جو ضعیف و نا قابلِ استدلال روایات کی بنیاد پر وضو کا حصہ بنا لیے گئے ہیں، پھر اللہ اکبر کہا، فر فر ثنا و الحمد للہ اور کتر کتر ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ۱] پڑھی اور رکوع میں چلے گئے۔ رکوع سے نجات پائی، پھر سر کو تھوڑا سا اوپر کی جانب جھٹکا دیا اور سجدے میں گر گئے۔ قومے کا پتا ہی نہیں کہ وہ بھی کوئی عمل ہے۔ پھر اس بے قرار سجدے سے سر کو تھوڑا سا اوپر کی جانب جھٹکا دیا اور کوشش کی کہ اوپر کو سر اٹھانے یا نیچے دوبارہ گرانے کے دوران ہی کسی نہ کسی طرح دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں کو چھو جائیں اور دوسرے سجدے کو جا لیا۔ دو سجدوں کے درمیان والے جلسے کا پتا ہی نہیں کہ وہ بھی کچھ ہے۔ اور اسی طرح دوسرے سجدے کے بارِ گراں سے بھی نجات حاصل کر لی۔ پھر دوسری رکعت کو بھی جا لیا اور جلسۂ استراحت سے ہم متعارف ہی نہیں۔ آپ ہی کہیے کہ کیا کثیر مسلمانوں کی نماز واقعی ایسی نہیں ہوتی کہ ساری نماز بے چین، رکوع و سجود غیر مطمئن اور قومہ و جلسہ مضطرب، بلکہ بے نشان؟ بے سرور نماز کا یہ انداز عوام الناس ہی پر بس نہیں، بلکہ ہمارے برصغیر کے کتنے ہی ائمہ مساجد ایسے ہیں کہ دورانِ امامت بھی ان کا قومہ و جلسہ مفقود اور رکوع و سجود بے حضور سے ہوتے ہیں۔ خصوصاً نمازِ تراویح کی دوڑ میں تو لوگ ان کا پیچھا کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ ہی نہیں، بلکہ ہم نے تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری نماز کا حسین سراپا ہی بگاڑ کر رکھا ہوا دیکھا ہے۔ ایسے ہی دلخراش مناظر کو دیکھ دیکھ کر علامہ اقبال بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے:

تیری نماز بے سرور، تیرا امام بے حضور

ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر!

بعض مسائل میں تو فقہی اختلافات کی آڑ لی جا سکتی ہے، مگر جو مسائل تمام ائمہ مجتہدین اور فقہا و محدّثین کے مابین متفق علیہ ہیں، ان کا بھی حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے۔ کسی وقت آپ مسنون نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قواعد و ضوابط کو پیشِ نظر رکھ کر نمازیوں کا سروے کر کے دیکھ لیں، اکیلے نمازی بھی اس سروے میں شامل کر لیں اور باجماعت بھی، طہارت و تکبیرِ اولیٰ سے لے کر صفوں کی درستی اور سلام پھیرنے تک آپ کو نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازِ مسلم میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور پھر چار و ناچار آپ کو بھی علامہ اقبال کے ان عبقری خیالات کی داد دینا پڑے گی، جنھیں وہ یوں کہہ گئے ہیں:

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے — محبت کا جنوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جنبِ اندروں باقی نہیں ہے!

اسلام کے نظامِ عبادات میں سے نماز ایک ایسا عمل ہے جس کو ادا کرنے سے مسلمانوں کو اپنے خالق و مالک سے سرگوشی کا موقع اور بارگاہِ لم یزل میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ قیامِ نماز، رکوع و سجود، قومہ و جلسہ اور قعدہ وغیرہ اپنے بّ کے ساتھ سرگوشیوں کے مختلف انداز اور مکالمے ہیں۔ کبھی بندہ دست بستہ ہو کر اظہارِ مدعا کرتا ہے تو کبھی عبودیت جھک کر اقرارِ عجز کرتی ہے۔ پھر انسان سروقد ہو کر ربوبیتِ الٰہی کی حمد و ستایش کا کلمہ پڑھتا ہے اور پھر اس کی جبینِ نیاز خاک و دھول پر سجدہ ریز ہو کر بِّ اعلیٰ کا قرب چاہنے لگتی ہے۔ پھر غلام اپنے آقا و مالک کے سامنے دو زانو بیٹھ کر تحیاتِ سرمدی کی پاکیزہ التجاؤں سے اس کی رضا و خوشنودی کی تمنا کرتا ہے کہ شانِ کریمی اپنے در پر آئے سوالی کا دامن بھر دے اور اپنے فضل و رحمت کے عطایا و ہدایا کے ساتھ رخصت کر دے۔[1]

ذیل میں ہم نمازِ پنج گانہ کی دو (فجر) ، تین (مغرب) اور چار (ظہر، عصر اور عشا کی) رکعتیں ادا کرنے کی مسنون کیفیت و طریقہ پیش کر رہے ہیں، جو صحیح اور کم از کم حسن درجے کی احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین و ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ کی روشنی میں بیان ہو گا۔ إن شآء اللہ۔

استقبالِ قبلہ

استقبالِ قبلہ کی فضیلت

: نماز کا آغاز کرنے سے قبل قبلہ رُو ہونا ضروری امر ہے۔ قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنا جہاں صحتِ نماز کے لیے ایک ضروری امر ہے، وہیں اس کے بڑے فضائل بھی ہیں، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے ہم جیسی نماز پڑھی اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، وہ ایسا مسلمان ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ یعنی عہد ہے۔ لہٰذا اللہ سے اس کے ذمہ و عہد کے معاملے میں غداری مت کرو!'' [1]

ایک دوسری روایت میں اِن افعال کے بعد مذکور ہے: ''وہ مسلمان ہے، جس کے وہی حقوق ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں اور اس کے وہی فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں۔''[2]

ان احادیث میں دیگر اُمور کے علاوہ قبلے کی عظمت و شان اور استقبالِ قبلہ کی فضیلت آئی ہے کہ استقبالِ قبلہ کی وجہ سے ایک شخص کو وہ تمام حقوق اور اسلامی مقام و مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے جو ایک مسلمان کے لیے خاص ہے۔

[1]بخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٩١) صحيح نسائي، رقم الحديث (١٤٤٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣)

استقبالِ قبلہ:

نماز کا آغاز کرتے وقت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رُو ہو جایا کرتے تھے۔ یہ چیز قطعی و حتمی ہے اور تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری اُمتِ اسلامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز کے لیے نمازی کا قبلہ رُو ہونا ضروری ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کی شکل میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ١٤٤]

"(اے نبی!) آپ کا بار بار آسمان کی طرف رُخ اٹھانا ہم نے دیکھ لیا ہے۔ لو ہم آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ اور آپ مسجدِ حرام (یعنی کعبہ شریف) کی طرف اپنا رُخ پھیر لیں۔" یہاں تک تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کی شکل میں ارشادِ الٰہی تھا، جبکہ اسی آیت میں آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور پوری اُمتِ قرآن سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ [البقرة: ١٤٤]

"اور جہاں کہیں بھی تم ہو اسی (مسجدِ حرام) کی طرف رُخ (کر کے نماز پڑھا) کرو!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "جب تم نماز پڑھنے لگو تو پہلے اچھی طرح وضو کرو اور پھر قبلہ رو ہو جاؤ اور تکبیرِ تحریمہ کہو۔" [1]

[1]صحيح البخاري (١/ ٥٠٢ تعليقاً) اور "كتاب الإستئذان" میں موصولاً۔ صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٠٦۔ ١٠٧)

استقبالِ قبلہ کا انداز:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ وہ نمازی جو مسجدِ حرام میں کعبہ شریف کے عین سامنے ہو اور اُسے دیکھ رہا ہو، اس کے لیے تو عین کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ علامہ ابن رشد نے "بدایۃ المجتہد" میں اس بات پر تمام علمائے اُمت کا اتفاق نقل کیا ہے۔[1]

اب رہا وہ شخص جو کعبہ شریف کے سامنے نہ ہو اور نہ اسے دیکھ رہا ہو، بلکہ وہ حدودِ حرم سے باہر کسی بھی دوسرے ملک میں ہو تو اس کے لیے عین کعبہ شریف کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں، بلکہ دُور دراز کے مسلمانوں کے لیے صرف سمتِ کعبہ یا کعبہ کی جہت کا ہونا ہی کافی ہے، جس پر امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنۃ میں ایک تو اس ارشادِ باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ [البقرة: ١٤٤]

"اور جہاں کہیں بھی تم ہو، اُسی (مسجدِ حرام) کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو۔" جبکہ اس پر بعض احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جن میں سے ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ)) [2]

"مشرق و مغرب کے مابین قبلہ ہے۔" اس حدیث کو متعدد سندوں سے مروی ہونے کی بنا پر محدّثینِ کرام نے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

[1]بداية المجتهد (١/ ١٥٧) [2] صحيح الترمذي، رقم الحديث (٢٨٣) ابن ماجه، رقم الحديث (١٠١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٥٨٤) شرح السنة (٢/ ٣٢٧) و الإرواء (٢/ ٣٢٤- ٣٢٥) [3] شرح السنة (٢/ ٣٢٧) إرواء الغليل (٢/ ٣٢٤- ٣٢٥)

جنگل یا بلادِ کفر و شرک یا اندھیرا ہونے کی صورت میں:

اگر کوئی شخص کسی ایسے مقام پر ہو، جہاں ہر سُو جنگل ہی جنگل، یا پھر اُسے بادل یا اندھیرے کی وجہ سے، یا بلادِ کفر و شرک میں ہونے کی وجہ سے قبلہ کا پتا نہ چل رہا ہو کہ کس جانب ہے؟ تو ایسے شخص کو چاہیے کہ امکانی حد تک قبلہ و جہتِ قبلہ کی جستجو و تلاش کرے اور بھرپور کوشش کے بعد اپنے گمانِ غالب کے مطابق کسی ایک طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے۔ اگر نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد پتا بھی چل گیا کہ اس نے غلط سمت پر نماز پڑھی ہے، اس کے باوجود اس کی نماز صحیح ہو گی اور صحیح سمت معلوم ہو جانے کے باوجود اس کو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ حضرت عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "ہم ایک سفر میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور وہ ایک انتہائی تاریک رات تھی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ قبلہ کس طرف ہے، لہٰذا ہر شخص نے جدھر چاہا، اُدھر ہی منہ کر کے نماز پڑھ لی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ سارا ماجرا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ سنایا، اس پر (سورۃ البقرہ کی آیت: ۱۱۵) نازل ہو گئی (جس میں ارشادِ الٰہی ہے:) "تم جدھر بھی منہ کرو، اللہ (کا قبلہ) اُدھر ہی ہے۔" مسند طیالسی میں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا ماجرا سن کر فرمایا: ((مَضَتْ صَلَاتُكُمْ)) "تمھاری نماز ہو گئی" پھر یہ آیت ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ [البقرة: ١١٥] نازل ہو گئی۔[1]

اس حدیث کی سند پر کچھ کلام ہے، لیکن شواہد و روایات کی بنا پر اسے حسن درجہ

[1]إرواء الغليل (٢/ ٣٢٣)

کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔ اُن شواہد میں سے ایک دار قطنی و بیہقی، معجم طبرانی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[1]

شدید خوف اور مجبوری و بیماری کی حالت میں :

آدمی کسی شدید خوف و خطرہ، انتہائی مجبوری و لاچاری یا پھر کسی بیماری میں مبتلا ہو، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ قبلہ کس طرف ہے، حسبِ موقع جس طرف بھی ممکن ہو، اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی وہ نماز صحیح ہو گی۔ ایسی صورت کے لیے خود قرآنِ کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ٢٣٩]

"اگر تم خوف زدہ ہو تو پیدل یا سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لو، اور جب تم حالتِ امن میں ہو تو پھر اللہ کو اسی طرح یاد کرو جس طرح یاد کرنے (نماز پڑھنے) کا طریقہ اس نے تمھیں سکھلایا ہے، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔" حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مُسْتَقْبِلِی الْقِبْلَةِ اَوْ غَيْرَ مُسْتَقْبِلِيْهَا"[2]

"تم قبلہ رو ہو یا نہ ہو۔" صحیح بخاری میں حضرت نافع رحمہ اللہ کا قول ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ تفسیر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔ گویا اس حالتِ خوف میں استقبالِ قبلہ کے سلسلے

[1]الإرواء (٢/ ٣٢٣- ٣٢٤) [2] صحيح البخاري (٨/ ١٩٩) صحيح ترمذي، رقم الحديث (٢١٥٨) صحيح نسائي، رقم الحديث (٢٤٥٦) ابن ماجه، رقم الحديث (٢)

میں رعایت ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر پڑھی جانے والی نماز کو "صلوٰۃ الخوف" کہا جاتا ہے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے اور حدیثِ شریف میں بھی۔

سواری پر:

استقبالِ قبلہ کے وجوب کے ساقط ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اونٹ یا گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو اور سواری کے دوران ہی نفلی نماز پڑھنا چاہے تو اس کے لیے اشارے سے ایسا کرنا جائز ہے، لیکن یہ نفلی نماز کے لیے ہے۔ کسی انتہائی مجبوری کے سوا یہ فرض نماز کے لیے روا نہیں ہے۔ نفلی نماز کے لیے وہ شروع میں تکبیرِ تحریمہ کے وقت ایک مرتبہ قبلہ رُو ہو جائے، پھر سواری چاہے کسی بھی طرف جاتی رہے کوئی حرج نہیں، کیوں کہ تب اس سے استقبالِ قبلہ ساقط ہو جاتا ہے، جس کا پتا متعدد احادیث سے چلتا ہے، جن میں سے ایک میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: "نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی سواری پر نفلی نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نماز کے آغاز میں) قبلہ رو ہو جاتے اور تکبیرِ اولیٰ کہتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری کو چھوڑ دیتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے جاتے ا

ور سواری چاہے جس طرف بھی مڑتی جاتی۔'' [1]

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (کبھی) اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے ہی نماز پڑھ لیتے تھے، وہ چاہے جس طرف بھی مڑتی جاتی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اتر کر قبلہ رُو ہو جاتے۔'' [2]

[1]صحيح أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ١٧٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٩) مختصر بخاري للألباني (١/ ١١٤)

ریل گاڑی، بس، کشتی اور بحری و ہوائی جہاز میں استقبالِ قبلہ:

اونٹ یا گھوڑے کی سواری کے دوران تو سوائے کسی انتہائی مجبوری کی شکل کے صرف نفلی نماز ہو گی، جبکہ ہوائی جہاز، بحری جہاز اور ٹرین یا ریل گاڑی کے مسافروں کو بھی اونٹ اور گھوڑے کے مسافروں پر قیاس کیا جائے گا۔ نفلی نماز کے آغاز میں قبلہ رُو ہو کر نماز شروع کر لیں اور پھر دورانِ نماز یہ سواریاں چاہے جدھر بھی جاتی رہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سواریوں پر سفر کے دوران میں اگر مسافر بآسانی کسی جگہ اتر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ فرض نماز اتر کر قبلہ رُو ہو کر ہی پڑھے، یہی اولیٰ ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ان سواریوں پر فرض نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے اور یہ نماز قبلہ رُو ہی پڑھی جائے گی، کیوں کہ یہ سواریاں اپنی وضع کے لحاظ سے ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں قبلہ رُو ہوا جا سکتا ہے، لہٰذا قبلہ رُو ہو کر ہی نماز پڑھیں۔ اگر نماز قبلہ رُو ہو کر شروع کی لیکن دورانِ نماز ٹرین یا بس نے رُخ بدل لیا تو فقہائے احناف کی رائے تو یہ ہے کہ نمازی بھی اپنا رخ بدل لے، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ المعروف بہ فتاویٰ عالمگیری کی پہلی جلد کے شروع میں ہی کشتی پر نماز کے ضمن میں لکھا ہے:

''وَيَلْزَمُ اِسْتِقْبَالُ الْقِبْلَةِ عِنْدَ الْاِفْتِتَاحِ وَكُلَّمَا دَارَتْ''[1]

''قبلہ کی طرف منہ کرنا افتتاح کے وقت بھی ضروری ہو گا اور اُس وقت بھی جب وہ مڑے۔''

لیکن واضح بات یہ ہے کہ یہ رائے اُس وقت تو قابلِ عمل ہے جب چند رکعتیں پڑھ کر نمازی سلام پھیرے اور اسے پتا چلے کہ سواری کا رُخ بدل چکا ہے تو وہ نئی رکعتوں کے آغاز میں ممکن ہو تو پھر استقبالِ قبلہ کر لے، البتہ سلام پھیرنے سے پہلے دورانِ نماز نمازی کو پتا ہی نہیں چل سکا کہ سواری کا رُخ کس طرف ہو گیا ہے

[1]فتاویٰ عالمگیری (١/ ٢٢٩، ٢٣٠) جدید فقہی مسائل، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ص: ٤٣)

اور وہ کس طرف مڑے تو استقبالِ قبلہ لازم نہیں ہو گا، نہ دورانِ نماز اتنی سوچ بچار کا موقع ہوتا ہے اور نہ عموماً ان سواریوں میں جگہ کی اتنی وافر گنجایش ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں بھی قرآن کے اُن الفاظ میں وارد حکم سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جن میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

"اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔" علاوہ ازیں اژدہام کی شکل میں تو علمائے احناف نے بھی تسلیم کیا ہے کہ بلا استقبال اور بلا قیام نماز پڑھ سکتا ہے۔ مثلاً اژدہام اتنا ہو کہ مڑنا ممکن نہ ہو، جیسا کہ عموماً ان سواریوں میں ہوتا ہے اور نہ باہر نکل کر نماز کی ادائیگی کا موقع ہو تو بلا استقبال بھی جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی لکھتے ہیں: "اگر فی الحقیقت ہجوم ایں قدر باشد کہ حرکتِ رکوع و سجود ممکن نیست و نیز بر صلوٰۃ خارج از ریل قادر نیست، بلا استقبال و بلا قیام ادا کنند۔"[1]

"اگر واقعی ہجوم اتنا ہو کہ رکوع و سجود کی حرکت ممکن ہو نہ ریل سے باہر نکل کر نماز ادا کرنا ممکن ہو تو بلا استقبالِ قبلہ اور بلا قیام نماز ادا کریں۔" ایسی صورت میں یوں نماز ادا کرنے کے جواز کا مولانا عثمانی صاحب کا یہ فتویٰ نقل کر کے "جدید فقہی مسائل" کے مؤلف نے اپنی طرف سے جو لکھا ہے کہ احتیاطاً اعادہ کر لینا چاہیے، بظاہر اس احتیاط کی کوئی دلیل نہیں اور نہ اعادے کی ضرورت ہے۔ یہ تفصیل تو ریل گاڑی اور بس کے بارے میں ہے، جبکہ کشتی، اسٹیمر، بحری جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ میں استقبالِ قبلہ کا حکم بھی یہی ہو گا، جو بس اور گاڑی میں ہے۔[2]

[1]فتاویٰ دار العلوم (۲/ ۱۴۶) بحوالہ جدید فقہی مسائل (ص: ۴۳) [2] اس کی تفصیل "نیل الأوطار" (۱/ ۲/ ۱۴۲، ۱۴۳) "جدید فقہی مسائل" (ص ۴۳۔ ۴۵) "صفۃ صلاۃ النبي ﷺ للألباني" (ص: ۳۵۔ ۳۷) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قیام

جب نمازی کسی نماز کے لیے قبلہ رُو ہو جائے تو حالتِ قیام میں تکبیرِ تحریمہ یا تکبیرِ اولیٰ، دعائے استفتاح یا ثناء، تعوّذ و تسمیہ یعنی "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" اور "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھی جاتی ہے اور پھر سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا فرض ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کی تفصیل میں جانے سے قبل نماز کے لیے قیام کی حیثیت و اہمیت واضح کر دی جائے۔ چنانچہ "الفقہ علی المذاہب الأربعۃ" کے مطابق اس بات پر پوری اُمت کا اجماع ہے کہ جو شخص کھڑا ہو سکتا ہو، اس کے لیے فرض نمازوں میں قیام یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے اور فقہائے احناف کے نزدیک تو نذر مانی ہوئی نماز، نمازِ وتر اور فجر کی سنتوں میں بھی کھڑے ہونا فرض ہے۔[1]

قیام یا کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی تاکید تو خود اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ [البقرة: ۲۳۸]

"تمام نمازوں کی خوب حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز (عصر) کی، اور اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کہ جس طرح فرماں بردار (غلام) کھڑے ہوتے ہیں۔" نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حکمِ الٰہی کی تعمیل میں نہ صرف فرض نمازوں میں بلکہ عموماً نفلی نمازوں میں بھی کھڑے ہوا کرتے تھے۔

[1]الفقہ علی المذاہب الأربعۃ (۱/ ۲۲۷)

مرض و عذر میں بیٹھنے کا جواز:

قیام یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے اور یہ تندرست و توانا آدمی کے لیے ہے، لیکن نفلی نمازوں میں یہ فرض نہیں، اگرچہ افضل ہے۔ بیٹھ کر نفلی نماز کا ذکر بعد میں آئے گا۔ البتہ آیئے پہلے اس بات کی تفصیل دیکھیں کہ قیام اگرچہ فرض نمازوں میں ضروری ہے، لیکن مرض و عذر کی حالت میں یہ ساقط ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجایش ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔'' [1]

کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز پڑھنے میں فرق:

مرض وغیرہ عذر کی حالت میں نمازی سے قیام کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہ جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھ لے، بیٹھ کر ممکن ہو تو فبہا، ورنہ لیٹ کر پڑھنے کے جواز کا بھی احادیث سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، اُسی کا عمل افضل ہے اور جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے سے آدھا اجر ملے گا۔ جس نے لیٹ کر نماز پڑھی، اسے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے سے بھی آدھا اجر و ثواب حاصل ہو گا۔'' [2]

[1]صحيح البخاري (٢/ ١٧٢، ١٧٣) صحيح ترمذي (١/ ١١٤) [2] صحيح البخاري (٢/ ٥٨٤) صحيح أبي داؤد (١/ ١٧٩) صحيح ترمذي، رقم الحديث (٣٠٥)، صحيح نسائي، رقم الحديث (١٥٦٦) صحيح ابن ماجه (١/ ٢٠٤)

بیماری اور سفر میں پورا اجر:

البتہ وہ مریض جس میں واقعتاً کھڑے ہونے کی ہمت ہی نہ ہو، اس کے بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے سے اس کے اجر و ثواب میں فرق نہیں آتا۔ جیسا کہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و ابو داود، ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ کا کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر پر نکلتا ہے تو اس کے لیے ویسا ہی اجر لکھا جاتا ہے، جیسا کہ اس کے مقیم و تندرست ہونے کے ایام میں (اس کے عمل پر) لکھا جاتا تھا۔'' [1]

سواری پر نماز اور قیام:

قیام یا فرض نماز کے لیے کھڑے ہونا فرض ہے، لیکن بعض صورتوں میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، جیسے مرض یا عذر کی بنا پر بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کا ذکر گزرا ہے۔ ایسے ہی کشتی، اسٹیمر اور سفینہ یا بحری جہاز کا معاملہ بھی ہے کہ اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہو تو کھڑے ہو کر ہی پڑھیں اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لیں، نماز ہو جائے گی، کیوں کہ سنن دار قطنی، مسند بزار اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے، جسے امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی نے "تلخیص المستدرک" میں اور شیخ البانی نے "صفۃ صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں ان کی موافقت کی ہے۔ اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحری جہاز میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1]صحيح البخاري (٢/ ٥٨٥) و كتاب الجهاد، رقم الحديث (٢٩٩٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٩)

((صَلِّ فِيْهَا قَائِمًا اِلاَّ اَنْ تَخَافَ الْغَرَقَ)) [1]

"بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو، سوائے اس کے کہ تمھیں غرق ہو جانے کا خطرہ ہو (تو بیٹھ کر پڑھ لو)۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی میں گر کر غرق ہو جانے کے اندیشے یا ایسے ہی کسی دوسرے عذر کے بغیر بحری جہاز میں بھی بیٹھ کر نماز کی اجازت نہیں۔ ہاں، اگر ایسا کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اس سے جہاں قیام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اسلام کے اپنے ماننے والوں کے لیے دی گئی آسانیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ غرق ہونے کے خطرے کے علاوہ اگر بالفرض نمازی کو اتنی جگہ نہیں مل رہی کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے، بلکہ وہ صرف بیٹھ کر ہی نماز پڑھ سکتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے ایک عذر ہے، جس سے اس کی استطاعت یا طاقتِ قیام کی نفی ہو جاتی ہے۔ صرف طاقت کی حدود کے اندر اندر ہی انسان مامور ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ١٦]

"جہاں تک تمھارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرو۔"

[1]صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٧٧) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ١٤٢) صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٣٧)

سُترہ

نمازی کو نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ کہنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کہاں کھڑا ہے؟ اگر سامنے صرف سجدے ہی کی جگہ ہے اور آگے دیوار ہے تو فبہا، ورنہ اسے اپنی جائے سجدہ سے تھوڑا آگے سُترہ رکھ لینا چاہیے، جس کا لغوی معنیٰ تو پردہ یا اوٹ ہے، جبکہ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتے وقت اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے، تاکہ کوئی شخص اس کے آگے سے گزرے تو اس کی نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ یہ تو نمازی کے لیے ایک

احتیاطی تدبیر ہے، ورنہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ نمازی کے آگے سے گزرے۔ سُترے کے حکم کے بارے میں اہلِ علم کے دو مشہور قول ہیں۔ ایک یہ کہ مستحب ہے اور دوسرا یہ کہ واجب ہے۔

[1] نمازی کے آگے سے گزرنے کی ممانعت:

امام کے سلام پھیرنے کے بعد، بالخصوص مساجد میں اس معاملے میں بڑی کوتاہی برتی جاتی ہے کہ عجلت سے کام لیتے ہوئے مسجد سے نکلتے یا جگہ بدلتے وقت لوگ اس بات کی پرواہی نہیں کرتے کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، وہ ان کے آگے ہی

[1]نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٢) صفة صلاة النبي ﷺ (ص ٣٩) حجة النبي ﷺ (٢١/ ٢٣، ١٣٥)

سے گزر جاتے ہیں، حالانکہ یہ فعل ناجائز اور گناہ ہے۔ علامہ ابن حجر ہیتمی نے توسُترہ کی موجودگی میں کسی کے آگے سے گزرنے کو گناہِ کبیرہ لکھا ہے اور سترہ نہ ہونے کی شکل میں نمازی کے آگے سے گزرنا اُن کے نزدیک مکروہ ہے، جس کی تفصیل "الزواجر عن اقتراف الکبائر" (۱/ ۱۴۲) میں مذکور چوراسی نمبر گناہِ کبیرہ کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ نمازی کے آگے سے گزرنے کی ممانعت پر جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اس کا کتنا گناہ ہے، تو اس کے لیے نمازی کے آگے سے گزرنے کی نسبت چالیس تک کھڑے رہنا گوارا ہوتا۔" اسی حدیث کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس کے ایک راوی ابو النصر کہتے ہیں: "مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس دن کہا، یا چالیس ماہ، یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال فرمایا۔" [1]

آگے سے گزرنے والے کو روکنا:

نمازی کے لیے جائز بلکہ ضروری ہے کہ اگر کوئی اس کے آگے سے گزرنے لگے تو وہ نماز ہی کی حالت میں اسے اچھے طریقے سے روک دے۔ اگر وہ اچھے طریقے سے رکنے والا نہ ہو اور نہ رکے تو پھر اسے سختی کے ساتھ منع کرے، جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

[1]صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٤، ٢٢٥) صحيح أبي داود (٦٤٩) صحيح ترمذى، رقم الحديث (٢٧٦) صحيح نسائي، رقم الحديث (٧٢٩) ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٥)

"اگر کوئی شخص اپنے سامنے سُترہ رکھ کر نماز پڑھ رہا ہو، جو اسے لوگوں سے بچائے اور کوئی شخص اس کے سامنے سے گزرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روک دے۔"

((فَاِنْ اَبٰی فَلْیُقَاتِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَیْطَانٌ)) [1]

"اگر وہ رکنے سے انکار کرے تو اس سے لڑائی کرے، بے شک (زبردستی آگے سے گزرنے والا) وہ شخص شیطان ہے۔"

نمازی اور سترے کے مابین فاصلہ:

نمازی خود سے کتنی دور سترہ رکھے؟ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانماز اور دیوار کے مابین اتنا فاصلہ تھا جس سے بکری گزر سکتی تھی۔" [2]

کوئی کہاں سے گزرے؟

اب رہا معاملہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی گنجایش کا تو بہتر تو یہی ہے کہ ارشاداتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے نمازی کے آگے سے گزرا ہی نہ جائے۔ اگر کبھی مجبوری وضروری ہی ہو جائے تو پھر اتنا دُور سے گزرے کہ نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل انداز نہ ہونے پائے

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨١، ٥٨٢) رقم الحديث (٥٠٩) مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٤) صحيح أبي داود (٦٤٥-٦٤٨) صحيح نسائي، رقم الحديث (٧٣٠٠) ابن ماجه، رقم الحديث (٩٥٤) [2] صحيح البخاري (١/ ٥٧٤) مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦) صحيح أبى داؤد، رقم الحديث (٦٤٤)

سُترہ کس چیز کا ہو؟

سُترہ کس چیز کا ہو؟ اس سلسلے میں متعدد احادیث ملتی ہیں، جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ مبارک سے پتا چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اشیاء کو سترہ بنا کر نماز پڑھی ہے۔ لہٰذا ان میں سے کوئی ایسی ہی چیز اس کام میں لائی جاسکتی ہے۔ وہ چیزیں درج ذیل ہیں:

1- برچھی یا نیزہ گاڑنا:

اس سلسلے میں پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے برچھی (بطورِ سترہ) گاڑ دی جاتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اُوٹ بنا کر نماز پڑھتے تھے۔"

2-3- سواری یا اس کی کاٹھی:

سترے کے طور پر سواری یا اس کی کاٹھی کا رکھنا بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری کا سترہ بنا کر نماز پڑھتے تھے۔''°

4-درخت:

درخت کو سترہ بنا کر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے، کیوں کہ یہ بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ غزوۂ بدر کے دن ہم میں سے کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا، سب سوئے ہوئے تھے سوائے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کو سُترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے اور صبح ہونے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں کرتے رہے۔''[1]

5-ستون:

یزید بن ابی عبید بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں آتا تو وہ مصحف کے ساتھ والے ستون کے پاس نماز پڑھتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھتے ہیں، (اس کی وجہ کیا ہے؟) تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے۔''[2]

6-ٹوپی :

سُترے کے طور پر ٹوپی یا پگڑی رکھ لینا بھی صحیح ہے، کیوں کہ سفیان بن عیینہ کا بیان ہے: ''میں نے شریک رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ایک جنازے کے موقع پر انھوں نے عصر کی نماز پڑھاتے وقت اپنے سامنے اپنی ٹوپی رکھ لی۔''[3]

درخت، ستون یا عصا کہاں ہو؟

ستون یا عصا وغیرہ کا سُترہ ہو تو وہ عین سامنے نہ ہو، بلکہ تھوڑا سا دائیں یا بائیں جانب ہو یا بالفاظِ دیگر عصا ناک کے سامنے نہ آئے، بلکہ دائیں یا بائیں کندھے کے سامنے ہو، کیوں کہ بعض اہلِ علم نے اسی انداز کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

[1]سنن النسائي بحواله فتح الباري (١/ ٥٨٠) [2] صحيح البخاري (١/ ٥٧٧) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٢٥، ٢٢٦) [3] صحيح أبي داؤد (١/ ١٣٤) شرح السنة (٢/ ٢٥١)

نماز میں صف بندی اور پاؤں کی کیفیت

جب امام کے پیچھے کھڑے ہوں تو اُس وقت مقتدیوں کو حکم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پاؤں ملا کر رکھیں، جیسا کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنی صفوں کو درست (سیدھا) رکھو! کیوں کہ میں تمھیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔" اس سے آگے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ہم میں سے ہر کوئی اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے کے ساتھ اور اپنے پاؤں کو اس کے پاؤں کے ساتھ ملاتا تھا۔" [1]

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسُدّ ُوْا الْخَلَلَ، وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتٍ لِلشَّيْطَانِ، وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللهُ، وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللهُ)) [2]

[1]صحيح البخاري (٢/ ٢١١) مسند أحمد (٣/ ١٨٢) [2] صحيح أبي داود، رقم الحديث (٦٢٠) مستدرک حاكم (١/ ٢١٣) صحيح الترغيب (٤٩٥)

"صفیں درست کر لو اور کندھوں کو ایک دوسرے کے برابر کر لو، خالی جگہیں پُر کر لو اور شیطان کے لیے (اپنے قدموں کے درمیان) خالی جگہ مت چھوڑو۔ جو صف کو ملائے، اسے اللہ ملائے اور جو صف کو توڑے، اسے اللہ توڑے۔" حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہماری طرف) متوجہ ہوئے اور تین بار یہ فرمایا: "تم اپنی صفوں کو سیدھا کر لو، اللہ کی قسم! تم اپنی صفوں کو درست کر لو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کے درمیان مخالفت پیدا کر دے گا۔" صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر نمازی اپنے برابر والے نمازی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور ٹخنے کے ساتھ ٹخنہ چمٹائے رکھتا تھا۔" [1]

نمازی کی نظر کہاں ہو؟

بعض لوگ جو نماز کے دوران میں دائیں بائیں اور آگے دُور تک جھانک لیتے ہیں، اُن کا یہ فعل درست نہیں، بلکہ خشوع و خضوع کے منافی ہے۔ نظریں پاؤں سے لے کر جائے سجدہ کے اندر اندر ہی رہنی چاہئیں، اس سے آگے نہیں۔ اس سلسلے میں ایک روایت بھی ہے، جسے شیخ البانی نے "صفۃ صلاۃ النبی ﷺ" میں بیہقی و مستدرک حاکم سے نقل کیا ہے: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو اپنے سرِ اقدس کو جھکائے ہوئے اپنی نظر (آسمان کی طرف نہیں بلکہ) زمین کی طرف رکھتے تھے۔" [2]

[1]صحيح البخاري (٢/ ٢١١) صحيح أبي داود (٦١٦) مسند أحمد (٤/ ٢٧٦) ابن حبان، رقم الحديث (٣٩٦، الموارد) [2] صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٤٤)

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ شیخ البانی نے ان کی موافقت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس حدیث کی شاہد وہ حدیث ہے جو تاریخِ دمشق ابن عساکر میں دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔[1]

اِدھر اُدھر جھانکنے پر وعید:

نماز میں بلا وجہ اِدھر اُدھر جھانکنے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لوگ نماز کے دوران میں اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں، ورنہ ان کی نظریں اُچک لی جائیں گی (وہ اندھے کر دیے جائیں گے)۔" [2]

آنکھیں بند یا کھلی رکھنا:

نماز کے دوران میں آنکھوں کو کھلا رکھنا یا بند کرنا بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہلِ علم نے کہا ہے کہ نماز کے دوران میں آنکھوں کو بند رکھنا مکروہ ہے۔ ان کا استدلال اس روایت سے ہے، جسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں کئی قرائن کے ساتھ غیر صحیح ثابت کر دیا ہے اور "فقہ السنۃ" میں سید سابق نے بھی لکھا ہے کہ نماز میں آنکھیں بند رکھنے کی کراہت کے بارے میں وارد حدیث صحیح نہیں ہے۔[3]

البتہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ نہیں

[1]صفة صلاة النبي ﷺ (ص: ٤٤) [2] صحيح مسلم عن أبي هريرة رضى الله عنه (٢/ ٤/ ١٥٢) صحيح نسائي، رقم الحديث (١١٤١) وابن ماجه، رقم الحديث (١٠٤٤) عن أنس رضى الله عنه - [3] فقه السنة (١/ ٢٦٩)

تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آنکھیں بند رکھیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو تشہد میں اپنی انگشتِ شہادت کی طرف دیکھتے تھے۔ پھر آگے چار احادیث بیان کی ہیں اور ان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنکھیں کھلی رکھنے پر استدلال کرتے ہوئے خود ہی بتایا ہے کہ ان احادیث سے استدلال کرنا محلِ نظر ہے، لہٰذا ان کے ذکر سے ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ البتہ آگے انھوں نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں آنکھیں کھلی رکھنے پر وہ احادیث دلالت کرتی ہیں، جن میں سے ایک صلاۃ الکسوف سے متعلق ہے، جس میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کا منظر دیکھا تو انگور کا گچھا توڑنے کے لیے دستِ مبارک آگے بڑھایا اور آگ دیکھی اور جہنم میں وہ عورت دیکھی، جس نے بلی کو بھوکے پیاسے مار دیا تھا۔ ایسے ہی اس حدیث سے بھی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنکھیں کھلی رکھنے کا پتا چلتا ہے، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کو اپنے آگے سے نہیں گزرنے دیا۔ نیز نماز کے دوران ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام کہنے والوں کو اشارے سے جواب دینا بھی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آنکھیں بند نہیں رکھتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر سلام کہنے والا ہوتا اُدھر ہی جوابی اشارہ فرماتے تھے۔ ایسے ہی نماز میں شیطان کے سامنے آجانے والی حدیث میں مذکور ہے کہ وہ آگ کا ایک شعلہ لے کر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گلے سے پکڑ کر اتنا دبایا کہ اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلی، جس کی ٹھنڈک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک پر محسوس فرمائی تو یہ رؤیتِ عین تھی۔

ایسی ہی کئی دیگر احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آنکھیں بند کر کے نہیں رکھا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ فقہا کا نماز میں آنکھیں بند رکھنے کے مکروہ یا غیر مکروہ ہونے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہلِ علم نے مکروہ کہا ہے اور بتایا ہے کہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا یہود کا فعل ہے۔

اہلِ علم کی ایک جماعت نے آنکھیں بند رکھنے کو مباح و غیر مکروہ کہا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا زیادہ باعثِ خشوع ہے، جبکہ خشوع ہی نماز کی روح، بھید اور مقصود ہے۔

آگے علامہ ابن القیم رحمہ اللہ ان دونوں نظریات پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اگر آنکھوں کو کھلا رکھنے سے خشوع میں خلل واقع نہ ہوتا ہو تو نماز میں آنکھیں کھلی رکھنا ہی افضل ہے، لیکن اگر جانبِ قبلہ بیل بوٹے یا دوسری کوئی ایسی چیز ہو جو نمازی کی توجہ کھینچ لے اور دل کی توجہ نماز سے ہٹا دے تو ایسے میں آنکھوں کو بند رکھنا قطعاً مکروہ نہیں، بلکہ ایسی حالت میں آنکھوں کے بند رکھنے کو بہ نسبت مکروہ کہنے کی مستحب کہنا اصلِ شریعت اور اس کے مقاصد سے زیادہ قریب ہے۔[1]

[1]زاد المعاد، علامہ ابن قیم (۱/ ۲۹۴)

مسائل و احکامِ نمازِ جنازہ

ذکرِ موت، فکرِ آخرت:

ابتدائے آفرینش اور تخلیقِ آدم علیہ السلام سے لیکر موت وحیات کا یہ سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا اور جو بھی جاندار اس دنیا میں آیا ہے اُسے اپنی حیاتِ مستعار مکمل کر کے ایک نہ ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہی ہوتا ہے، موت کا یہ جام اپنے کئے ہوئے عملوں کے اعتبار سے چاہے کسی کے لیے تلخ ہو یا شیریں بہر حال ہر کسی کو پینا ہی ہوتا ہے اور موت وہ اٹل حقیقت ہے جس سے کسی نیک و بد، شاہ و گدا اور غنی و فقیر کو مفرّ نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ کریم کے مختلف مقامات پر اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، چنانچہ سورۂ آلِ عمران، آیت:۱۸۵، سورۂ انبیاء، آیت:۳۵ اور سورۂ عنکبوت، آیت:۵۷ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾

"ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔"

جب ہماری زندگی کی بس صرف یہی حقیقت ہے تو آج اِسکا، کل اُسکا اور پھر ایک دن اپنا بھی جنازہ اُٹھے گا اور اسکا اندازہ و مشاہدہ ہم آئے دن اپنی آنکھوں سے کرتے ہی رہتے ہیں مرنے والے کیلئے اسکے اعزّاء او اقارب کی طرف سے سب سے بڑا تحفہ اسکے جنازے میں شریک ہونا اور اسکے لیے دعائے مغفرت کرنا ہوتا ہے۔ اب ذرہ وہ لوگ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں جنہیں دُعاء جنازہ ہی نہیں آتی، وہ اپنے کسی عزیز کو الوداعی تحفہ کیا دیں گے؟ سوائے اسکے کہ امام کے پیچھے ستون بن کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ ٹسوے تو بہاتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی دنیوی مصلحت کے منقطع ہو جانے یا کسی خاص قرابت کی وجہ سے اسکی موت پر دُکھ بھی پہنچا ہو اور آنکھوں سے ٹپکنے والا پانی واقعی اشک ہائے غم ہو لیکن ذرا اس نقطے پر کچھ تو غور کیجئے کہ

یہ اب اسکو دے کیا سکے گا؟ جبکہ اِس نے اس پہلو کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی، گلستانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کلیوں سے کبھی کچھ چنا ہی نہیں تھا کہ محبت و شفقت اور اُنس و قرابت کا ثبوت دینے والی دعاؤں کی کلیوں سے ہار بنا کر اپنے سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ جانے والے اس عزیز کے گلے میں سجادے۔ ماں کی ممتا کے انمٹ نقوش تو اسکے دل پر ثبت ہیں لیکن اسکے دمِ واپسیں یہ اُسے کیا صلہ دے گا؟ باپ کی شفقت اُسے کبھی نہیں بھولے گی مگر اُسے جاتے وقت یہ کیا پیش کرے گا؟ بہن بھائی کی محبتیں اسے مدتوں یاد رہیں گی مگر اِس نے اُنہیں انکی محبتوں کا کیا صلہ دیا؟ میاں بیوی کا پیار انہیں عمر بھر تڑپائے گا مگر جب وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہونے لگے تو ایک نے دوسرے کی عمر بھر کی چاہتوں کا کیا بھرم رکھا، نازونعمت سے پالے ہوئے بیٹے بیٹی کی وفات اسے زندگی سے بیزار کر گئی ہے مگر اس کی موت پر اس نے اسے کیا دے بھیجا، انتہائی قریبی تعلقِ خاطر والے احباب میں سے کسی کی جو انمرگی اِسے ادھ موا کر گئی ہے لیکن اسکی طرف سے آج وہ خالی ہاتھ ہی جا رہا ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ یہ کتنا تلخ اور افسوس ناک پہلو ہے اور یہ بات کوئی افسانہ بھی نہیں بلکہ حقیقت ہے، یقین نہ آئے تو آج ہی سروے شروع کر دیں، اپنے اعزّاء او اقارب اور دوست و احباب سے رابطہ کریں اور ان سے دعاء جنازہ تو سن کر دیکھیں، حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی کہ سَو میں سے کتنے لوگوں کو یہ دعاء یاد ہے۔ اور آپ کی سروے رپورٹ میں دُعاء یاد نہ کرنے والوں کی طرف سے جو بہانہ شہ سرخی کے ساتھ لکھا جاسکے گا وہ یقیناً صرف یہی ہو گا کہ جی! بات دراصل یہ ہے کہ چھوٹے ہوتے تھے تو ایک مرتبہ یہ دعاء یاد تو کی تھی مگر پھر بھول گئی ہے اور ویسے بھی اسکے استعمال کا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے اسلئے بھی یاد نہیں رہ سکی۔ یہ بہانہ اور وہ بھی ایک مسلمان سے، یہ بہت بڑا المیہ ہے اور یہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ دوسروں کی تو کجا ہم اپنی موت کو بھی بھول چکے ہیں، اور اس دنیا کی رنگینیوں میں کچھ

اس طرح کھو گئے ہیں کہ اپنے خالق ومالک کی طرف پلٹ کر جانے کا بھی خیال نہیں آتا، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ موت بھی ہمیں پوچھ کر اور ہماری مرضی کے مطابق آئے اور ربِ کائنات اپنے نظام کو بدل کر ہمارا انتظار کرے۔ بقولِ اقبال:

انسان تو اللہ کو یہ کہنے پر تلا ہوا ہے کہ

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ انتہائی مادہ پرستانہ، غافلانہ بلکہ جاہلانہ اور خطرناک ذہن ہے جو کسی مسلمان کو بہر حال زیب نہیں دیتا لہٰذا ذکرِ موت اور فکرِ آخرت سے اتنا بھی غافل نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ بقولِ شاعر

اَلْمَوْتُ كَأْسٌ كُلٌ شَارِبُوْ هَا

''موت ایک پیالہ ہے جو ہر کسی نے ہی پینا ہے۔''

نوحہ خوانی اور سوگ وماتم :

موت شہید کی ہو یا عام مرگ، موت بہر حال موت ہی ہے جو پسماندگان اور عزیز واقارب کیلئے صدمہ اور دُکھ کا باعث بنتی ہے، اور کون نہیں جانتا کہ یہ زندگی خوشی وغم اور شادی ومرگ سے عبارت ہے۔ موت وحیات کا نظام کائنات کا ایک جزء ہے اور ہر ذی رُوح کی موت کا وقت مقرر ہے جس سے کسی کو مفرّ نہیں، برگزیدگانِ الٰہ پیغمبر علیہم السلام ہوں، ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم یا دیگر اولیاء اللہ رحمہم اللہ ہوں، موت کا جام ہر کسی کیلئے مقرر ہے، دشمنانِ دین ہوں، اپنے آپ کو ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی﴾ کہلوانے والے صاحبِ جبرُوت وسطوت ہوں، شاہ ہوں یا گدا، امیر ہوں یا فقیر، موت بہر حال سب کا مقدر ہے، کیونکہ سورۂ آل عمران آیت:۱۸۵، سورۂ انبیاء آیت:۳۵، اور سورۂ عنکبوت، آیت:۵۷ میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔''

اسی قانونِ الٰہی کے تحت جب کسی کو موت آجائے تو ایسے موقعہ پر فطرتی اَمر ہے کہ پسماندگان کو صدمہ اور دُکھ تو پہنچے گا، مگر اس کے اظہار کی کہاں تک اور کس طرح گنجائش ہے، اس سلسلہ میں بھی شریعتِ اسلامیہ میں واضح ہدایات موجود ہیں، چنانچہ سورۂ بقرہ، آیت:۱۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع پر صبر وہمّت سے کام لینے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَبَشِّرِالصّٰبِرِيْنَ علیہم السلام الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ علیہم السلام اُوْلٰٓئِکَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (سورۂ بقرہ:۱۵۵تا۱۵۶)

"اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں جو مصیبت کے وقت یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کیلئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے، اور یہی لوگ (آخرت میں) کامیابی پانے والے ہیں۔"

مصیبت آجائے، دل دُکھوں سے بھر جائے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑے تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رونا اور آنسو بہانا بھی جائز ہے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں ایسے کئی مواقع پر خود نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا آنسو بہانا ثابت ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پر[1] بخاری و مسلم اور ابو داؤد میں اپنی بیٹی کی ایک لختِ جگر (امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہما) پر[2] اور بخاری و مسلم اور ابو داؤد میں خود اپنے لختِ جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پر آنسو بہانا ثابت ہے۔[3] بشرطیکہ رونے اور آنسو بہانے کے ساتھ زبان نہ چلائی جائے،

[1]صحیح بخاری ۱۳۰۴،مسلم مع النووی ۳،۶،۲۲۶ [2] صحیح بخاری(۱۲۸۴)،مسلم مع نووی ۳،۶،۲۲۴،صحیح ابی داؤد(۲۶۸۰) [3] صحیح بخاری(۱۳۰۳)،۳،۲۰۶،مسلم مع نووی ۸،۱۵،۷۵،صحیح ابی داؤد(۲۶۸۱)ریاض الصالحین بتحقیق الارناؤ وط ص:۳۸۸۔۳۸۹

مرنے والے کی صفات اور اس کی موت کی وجہ سے پیش آنے والے مصائب کا ذکر نہ چھیڑا جائے، کیونکہ بخاری و مسلم اور ابو داؤد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِنَّ اللهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ وَلٰكِنْ يُعَذِّبُ بِهٰذَا أَوْ يَرْحَمُ(وَأَشَارَ اِلٰى لِسَانِهٖ))[1]

"اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آنسو بہانے اور دل کے حُزن و غم پر عذاب نہیں کرے گا، البتہ اس کے عذاب دینے یا رحم فرمانے کا تعلق اِس سے ہے، اور یہ کہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔" اسلام میں مقام و مرتبہ شہادت اور شہادت یا طبعی موت مرنے والوں کے پسماندگان کے صبر و ہمت کرنے اور ایسے مواقع پر آنسو بہانے کے جواز کی طرف اشارہ تو ہو چکا ہے، اور آنسو بہانے کے ساتھ اس شرط کا بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس کے ساتھ زبان سے بَین و نوحہ خوانی، واویلا اور واہی تباہی جائز نہیں، کیونکہ نوحہ خوانی آگے جانے والے کے ساتھ خیر خواہی نہیں بلکہ نادانستہ دشمنی کے مترادف ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور ترمذی و نسائی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اَلْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِى قَبْرِهٖ بِمَا نِيْحَ عَلَيْهِ))[2]

"میت کو اپنے پسماندگان کی نوحہ خوانی کے سبب قبر میں عذاب ہوتا ہے۔" اس حدیث شریف کا مفہوم بظاہر سورۂ انعام کی آیت:۱۶۴، سورۂ اسراء، آیت:۱۵، سورۂ فاطر، آیت:۱۸، سورۂ زمر، آیت:۷ اور سورۂ نجم کی آیت ۳۸ کے معارض ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

[1]بخاری مع الفتح(۱۳۰۴)۳،۲۰۹،صحیح مسلم مع نووی ۳،۶،۲۲۶،صحیح ابی داؤد(۲۶۸۱) [2] صحیح بخاری ۳،۱۲۹۲،۱۹۱،مسلم مع نووی ۳،۶،۲۲۹،صحیح الترمذی ۸۰۰،صحیح نسائی ۱۷۴۹،ابن ماجہ(۱۵۹۳)ریاض الصالحین ص:۶۳۳

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى﴾

"اور کسی کے گناہ کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اُٹھائے گا۔"

تاہم اہلِ علم نے اس تعارض کو دُور کرنے کیلئے کئی آراء ذکر کی ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ آگے جانے والا اگر پسماندگان کو بَین و نوحہ کرنے کی وصیّت کر کے جائے اور وہ اس پر عمل کر گزریں تو اُسے اُن کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائیگا۔ اور بعض نے اس حدیث میں مذکور لفظ "عذاب" کا مفہوم "احساسِ الم" بیان کیا ہے، جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ (صحیح احادیث میں) رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ پسماندگان کے بَین کرنے سے میّت کو عذاب ہوتا ہے:

((فَسَمِعْنَاوَ اَطَعْنَا))

"پس ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سُنا اور اطاعت کی۔" اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کہتے۔[1]

بعض لوگ اور خصوصاً خواتین غم کے موقعوں پر صبر کا دامن چھوڑ دیتی ہیں اور جائز رونے اور آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ ہی نوحہ خوانی بھی شروع کر دیتی ہیں کہ رونے کے ساتھ ساتھ مرنے والے کی صفات اور اس کی موت کی وجہ سے پیش آمدہ مصائب کی گنتی شروع ہو جاتی ہے، اور ایک راگ کے ساتھ بَین کئے جاتے ہیں۔ اس نوحہ خوانی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع کیا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم اور ابو داؤد و نسائی میں حضرت اُمّ عَطِیّہ رضی اللہ عنہا سے مَروی ہے:

((أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم.عِنْدَ الْبَيْعَةِ اَنْ لَا نُنوحَ))[2]

"ہم سے بیعت لیتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عہد لیا تھا کہ ہم نوحہ خوانی نہیں کریں گی۔"

[1]للتفصیل الفتح الربانی ۷،۱۲۶-۱۲۹ [2] صحیح بخاری(۱۳۰۶)،مسلم مع نووی(۳،۶،۲۲۷)،صحیح ابی داؤد(۲۶۸۲)،صحیح النسائی(۳۸۹۶)ریاض الصالحین ص:۶۳۴

جبکہ صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِثْنَتَانِ فِی النَّاسِ هُمَابِهِمْ كُفْرٌ ،اَلطَّعْنُ فِی النَّسْبِ وَالنِّيَاحَة عَلَى المَيِّت))[1]

"لوگوں میں دو باتیں ایسی ہیں جن کا ارتکاب کفر ہے: کسی کے نسب میں طعن کرنا اور میّت پر نوحہ خوانی کرنا۔" جو لوگ کسی کی مرگ پر جوشِ غم میں ہوش کھو دیتے ہیں اور بَین و نوحہ خوانی کے ساتھ ساتھ سَر کے بالوں کو بکھیرنا اور نوچنا، رُخساروں کو پیٹنا، سینہ کوبی و ماتم کرنا اور کپڑے پھاڑنا شروع کر دیتے ہیں، ایسے افعال کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں صحیح بخاری و مسلم اور ترمذی و نسائی میں اِرشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَوَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَابِدَعْوٰى الْجَاهِلِيَّةِ))[2]

"جو اپنے رخساروں کو پیٹے، کپڑے پھاڑے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح نوحہ خوانی کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" بخاری و مسلم اور ابو داؤد و نسائی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مَروی ہے:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم بَرِئَ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَةِ))[3]

"بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بَین کرنے، سَر کے بال بکھیرنے اور مونڈنے

[1]مختصر مسلم للمنذری تحقیق البانی۵۵،الایمان،ریاض الصالحین ص:۶۳۶ [2] بخاری ۳،۱۲۹۴،۱۳۳،مسلم ۱۰۳،ترمذی:۹۹۹،صحیح نسائی:۱۷۵۴،ابن ماجہ:۱۵۸۴و ریاض الصالحین:۶۳۳ [3] بخاری ۳،۱۳۱-۱۳۲ تعلیقاً،مسلم،کتاب الایمان:۱۰۴،صحیح ابی داؤد:۲۶۸۴،صحیح النسائی:۱۷۵۷،ابن ماجہ:۱۵۸۶

اور کپڑے پھاڑنے والی عورتوں سے براءت کا اظہار فرمایا ہے۔" ابو داؤد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عَہد لیا تھا:

((اَنْ لَّا نَخْمِشَ وَجْهاً وَلَا نَدْعُوْ وَيْلًا وَلَا نَشُقَّ جَيْباً وَلَا نَنْشُرَ شَعْراً))[1]

"(کہ) مصیبت میں نہ ہم مُنہ نوچیں گی، نہ واویلا کریں گی، نہ کپڑے پھاڑیں گی، اور نہ بال بکھیریں گی۔" عورتیں چونکہ مَردوں کی نسبت کمزور طبع واقع ہوئی ہیں اور اُن سے ایسے امور کا صدور ممکن ہونے کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ عہد لیے اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی عورت فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے تو ایسی عورت کے بارے میں صحیح مسلم، ابن ماجہ، مسند احمد اور بیہقی میں اِرشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
((اَلنَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قِطْرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ))[2]

"نوحہ خوانی کرنے والی عورت اگر توبہ کئے بغیر مر گئی تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں اٹھائی جائے گی کہ آتش گیر مادے (چقماق) کی قمیض پہنے ہو گی اور اسے خارش کی ذرع پہنائی جائے گی۔"[3]

[1]صحیح ابی داؤد(۲۶۸۵)،ریاض الصالحین ص:۶۳۵ [2] مسلم مع نووی ۳،۶،۲۳۶،۲۳۵،ابن ماجہ:۱۵۸۱-۱۹۵۲،۱۵۸۲،مسند احمد ۵،۳۴۴،۴۳،۴۲،ریاض الصالحین ص:۶۳۵،الصحیحہ ۴،۴۹۵ [3] صرف بَین و نوحہ خوانی ہی نا جائز نہیں،بلکہ اس کا سُننا بھی درست نہیں ہے،کیونکہ ابو داؤد،مسند احمد،بیہقی،بزار اور طبرانی میں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:(لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم...اَلنَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ)(الفتح الربانی ۷،۱۳-۱۲)" نبی ﷺ نے نوحہ خوانی کرنے اور سننے والی پر لعنت فرمائی ہے۔" تاہم یہ حدیث ضعیف ہے،تفصیل کیلئے تخریج صلوٰۃ الرسول رقم ۶۳۰۔

اور مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((ثُمَّ يُعْلٰى عَلَيْهَا دِرْعٌ مِنْ لَهَبِ النَّارِ))[1]

"(کہ) پھر اس آتش گیر مادے کے اُوپر آگ کے شعلے کی ذرع ہو گی۔" شریعتِ اسلامیہ ہر معاملہ میں چونکہ اعتدال پسند ہے، اس میں نہ خوشی کے مواقع پر حدِّ اعتدال پھلانگنا جائز ہے اور نہ ہی مرگ کا سوگ منانے پر لگائی گئی حدود اور پابندیاں توڑنا روا ہے۔ ایسے مواقع پر عورت کی طبیعت کا لحاظ

رکھتے ہوئے اسلام نے اس کے لیے شوہر کے سوا ہر عزیز کی مرگ کا صرف تین دن سوگ منانا جائز رکھا ہے، البتہ اگر کسی کے شوہر کی مرگ ہو جائے تو اس عورت کو چار ماہ اور دس دن تک سوگ منانے کی اجازت ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ، آیت:۲۳۴ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾

"تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس (دن) عدت میں رکھیں۔" اور یہ سوگ یا عدّت مدخولہ، غیر مدخولہ، جوان اور بوڑھی ہر عورت کے لیے ہے سوائے حاملہ کے کیونکہ اسکی عدّت وسوگ کا زمانہ وضع حمل تک ہے۔ چنانچہ سورۃ الطلاق، آیت:۴ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿.....وَاُوْلَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

"حاملہ عورتوں کی عدّت ان کا وضع حمل ہے۔"

[1]مسند احمد ۵،۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴،بحوالہ الصحیحہ ۴،۵۹۵،ابن ماجہ(۱۵۸۲)لیکن یہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔

ان ایّام میں وہ زیب و زینت نہ کرے، نہ زیورات اور ریشمی کپڑے پہنے، اور نہ ہی خوشبو، مہندی اور سرمہ وغیرہ لگائے کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((لَايَحِدُّ الْمَرْأَةُ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّاعَلٰى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْراً،وَلَا تَلْبَسُ ثَوْباً مَصْبُوْغاً اِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ،وَلَا تَكْتَحِلُ وَلَا تَمَسُّ طِيْباً اِلَّا اِذَا طَهُرَتْ نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ أَوْاَظْفَارٍ))[1]

"کوئی عورت تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائے سوائے شوہر کی وفات کے، اُس پر چار ماہ دس دن سوگ منا سکتی ہے۔ وہ رنگین کپڑے نہ پہنے سوائے یمنی چادر کے، وہ نہ سرمہ لگائے اور نہ ہی خوشبو استعمال کرے سوائے اس دن کے جس دن وہ غسلِ حیض سے فارغ ہو تو عود وغیرہ کے بخور (یعنی دھوئیں) کا استعمال کر سکتی ہے۔" امام نووی رحمہ اللہ کے بقول یہ بھی کوئی خوشبو کی غرض سے نہیں بلکہ محض خون جاری رہنے سے پیدا ہونے والی بدبُو کو زائل کرنے کی غرض سے جائز ہے۔[2]

ابو داؤد اور نسائی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((وَلَا تَخْتَضِبُ))" اور وہ مہندی و خضاب بھی نہ لگائے۔"

نسائی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

((وَلَا تَمْتَشِطُ))"، اور وہ کنگھی بھی نہ کرے۔"

یہ احکام صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور وہ بھی عام عزیزوں کی نسبت صرف تین دن اور شوہر کیلئے چار ماہ دس دن یا وضع حمل تک، اور مَردوں کیلئے ان امور میں سے کوئی

[1]بخاری(۴۲-۵۴۳)۹،۴۰۱-۴۰۲،مسلم مع نووی ۵،۱۰،۱۱۸،صحیح ابی داؤد ۱۸-۱۹-۲۰،صحیح نسائی(۳۳۰۸ و ۳۳۱۰)،ابن ماجہ(۲۰۸۷)،الفتح الربانی ۷،۱۵۰ [2] مسلم مع نووی ۵،۱۰،۶۱۹

ایک بھی ایک دن کے لیے بھی جائز نہیں سوائے دل کے غم اور آنکھوں کے آنسوؤں کے۔ اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو چودہ سو سال پہلے واقع ہونے والی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی موتِ شہادت پر سوگ منا رہے ہیں، وہ تعلیماتِ اسلام کے سراسر منافی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں، جس کا کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔

احکام الجنائز کی وسعت:

کتبِ حدیث و فقہ میں "احکام الجنائز" یعنی "جنازے کے مسائل" کے عنوان سے جو حصّے مخصوص کئے گئے ہیں ان میں صرف نمازِ جنازہ کے مسائل ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں مرض و بیماری، علاج معالجہ اور بیمار کی عیادت کے فضائل و احکام، موت اور میت کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسائل، غسلِ میت اور تکفین کے مسائل، جنازہ اُٹھانے اور اسکے ساتھ چلنے کے مسائل، نمازِ جنازہ کے احکام، تدفین اور قبر کے بارے میں مسائل اور تعزیت و زیاتِ قبور کے شرعی احکام و مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان ابواب میں سے ہر باب کے ذیل میں درجنوں امور کا تذکرہ کیا گیا ہے اور شروحِ حدیث و کتبِ فقہ میں ہر مسئلہ کے بارے میں شرعی حکم بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان امور کی تردید بھی کی گئی ہے جو کہ شریعت میں تو ثابت نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی ہوائے نفس اور ذاتی اغراض و مقاصد کیلئے انہیں دین میں داخل کر رکھا ہے اور ان میں سے بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگر سراسر خانہ ساز اور جعلی و من گھڑت نہیں ہوتے تو کم از کم کسی صحیح ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے انکا پتہ نہیں ملتا اور جن روایات کے سہارے ان کی عمارت قائم کی جاتی ہے محدّثینِ کرام اور ماہرین علمِ حدیث کے یہاں وہ موضوع یا ضعیف ہوتی ہیں جن سے استدلال اہلِ علم کے نزدیک روا نہیں ہوتا، ایسے تمام امور بدعات میں شمار کئے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے اس مختصر سے رسالہ میں مذکورہ تمام عنوانات، انکے ذیلی مسائل اور متعلقہ بدعات کا یکے بعد دیگرے ذکر کرنے لگیں تو اسکے لیے ایک بڑا دفتر درکار ہوگا، لہذا یہاں ہم انتہائی اختصار کے ساتھ صرف بعض اہم و ضروری مسائل ہی آپ کے سامنے رکھنے پر اکتفاء کرینگے۔

مریض کی ذمہ داریاں:

1۔ بیماریاں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں لہٰذا مریض کو جزع فزع، چیخ و پکار اور بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ صبر و شکیب سے کام لیتے ہوئے اللہ سے اجر و ثواب اور صحت و عافیت کا امیدوار رہے۔ یہ بیماری اسکی آزمائش و امتحان کے ساتھ ساتھ اسکے گناہوں کا کفّارہ اور اسکے لیے خیر ہی خیر ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم، بیہقی اور مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((عَجَباً لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَہٗ کُلَّہٗ خَیْرٌ ،وَلَیْسَ ذَالِکَ لِاَحَدٍ اِلَّالِمُؤْمِنٍ:اِنْ اَصَابَتْہُ سَرّآئُ شَکَرَ فَکَانَ خَیْراً لَہٗ وَاِنْ اَصَابَتْہُ ضَرّاءُ صَبَرَ فَکَانَ خَیْراً لَہٗ))[1]

2۔ ہر شخص کو عموماً اور بیمار کو خصوصاً اللہ کے عذاب سے ڈرتے اور اسکی رحمتوں کا امیدوار رہنا چاہیئے کیونکہ ترمذی وابن ماجہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان کی عیادت فرمائی جو کہ قریب الموت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو؟ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! مجھے اللہ سے (خیر کی) امید ہے اور میں اپنے گناہوں پر ڈر بھی رہا ہوں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ فِیْ مِثْلِ ھَذَا الْمَوْطِنِ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ مَایَرْجُو وَاَمَّنَہٗ مِمَّا یَخَافُ))[2]

[1]مختصر مسلم:۲۰۹۲،بیہقی،مسنداحمد.صحیح الجامع الصغیر:۳۹۸۰ [2] ترمذی،ابن ماجہ،صحیح الترغیب ۳،۳۲۲

"ایسے موقع پر بندۂ مؤمن کے دل میں جو بھی امید پیدا ہو اللہ اسے وہ عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے وہ ڈرے اللہ اسے اس سے محفوظ رکھتا ہے۔"

jh 3۔ بیمار کی بیماری چاہے کتنی بھی شدید کیوں نہ ہو جائے اسے موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بیماری کی حالت میں موت کی تمنا کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمادیا اور ایسی حالت میں اگر کچھ کہنا ہی ہو تو یہ دعاء کریں

: ((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْراً لِّیْ وَتَوَ فَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْراً لِّیْ))[1]

"اے اللہ! جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو جائے تو مجھے فوت کر دینا۔"

4۔ اگر اسکے ذمے لوگوں کے حقوق اور قرضہ وغیرہ ہو تو حسبِ استطاعت وہ ادا کر دے یا پھر اپنے گھر والوں کو اسکے بارے میں تاکید کر دے کیونکہ یہ حقوق العباد ہیں اور یہ کسی بھی صورت معاف نہیں جب تک کہ وہ ادا نہ کئے جائیں یا پھر خود حقوق والے معاف نہ کر دیں بصورتِ دیگر قیامت کے دن بھی یہ ادا کرنے ہی پڑیں گے اور ظاہر ہے اس وقت نہ کسی کے پاس درہم و دینار ہونگے نہ کوئی دوسرا ذریعۂ ادائیگی، اس وقت معاملہ سب نیکیوں اور برائیوں سے ہی نمٹایا جائے گا جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں وارد بعض صحیح احادیث سے پتہ چلتا ہے۔[2]

5۔ اگر اسکے پاس کوئی مال وغیرہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وارثوں کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں اور دینی اداروں کیلئے اپنے مال سے وصیت کر جائے جو ایک تہائی (1/3) سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے

[1]بخاری،مسلم،ابوداؤد،ترمذی،ابن ماجہ،مستدرک حاکم۱،۳۳۹،بیہقی۳،۳۷۷،صحیح الترغیب۳،۳۱۵ [2] بخاری،مسلم،بیہقی ۳،۳۶۹ مستدرک حاکم ۲،۲۷،مسند احمد ۲،۷۰۔۸۲،صحیح الجامع:۶۵۴۶،۶۵۱۱،۸۷

کیونکہ اس سے زیادہ کی وصیت کرنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہی رہے تو اچھا ہے جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث سے پتہ چلتا ہے۔اور وارثوں کیلئے تو وصیت کرنا جائز ہی نہیں ہے۔[1]

تاہم بعض لوگ مکانوں اور دکانوں کی وصیت کسی وارث(بیوی وغیرہ)کیلئے کر جاتے ہیں اور مرتے مرتے اس ظلم کا ارتکاب اور دوسرے ورثاء کو محروم کرنا پس ماندگان کی ناراضگی کے علاوہ اسکی آخرت کو بھی برباد کر دیتا ہے۔اسی طرح مرگ و مقابر پر اپنائی جانے والی تمام بدعات(ماتم و نوحہ خوانی، قل، ساتے، دسویں، چہلم، عرس اور پختہ قبروں) سے اپنے وارثوں کو منع کر جائے۔

حسنِ خاتمہ کی علامات و نشانیاں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض علامات و نشانیاں مقرر فرمائی ہیں جن سے کسی کے حسنِ خاتمہ کی دلیل لی جاسکتی ہے جن میں سے اختصار کے ساتھ ہم بعض امور ذکر کر دیتے ہیں اور جسے تفصیل مطلوب ہو وہ علّامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "احکام الجنائز وبدعہا" کا مطالعہ کرے جو اپنے موضوع کی انتہائی جامع ومانع کتاب ہے:

1۔مرتے وقت کسی کی زبان سے کلمہ (لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللہ) جاری ہو جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جنت کی بشارت دی ہے۔[2]

جبکہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر وفات کے وقت کسی کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے تو اسکے چہرے کا رنگ کھل جاتا اور چمک اٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسکی تکلیف کو ختم کر دیتا ہے۔[3]

[1]دیکھئے:البقرہ:۱۸۰،بخاری،مختصر مسلم:۹۸۲،سنن اربعہ،مؤطا امام مالک،بیہقی ۶،۲۶۹،مسند احمد ۲۰۷۶،۲۰۲۹،۱۵۲۴،صحیح الجامع:۵۶۱۵،مجمع الزوائد:۴،۳۱۲ [2] صحیح ابن حبان:۷۱۹۔الموارد عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ،مستدرک حاکم۱،۳۵۰۔۳۵۱ [3] مسند احمد:۱۳۸۴،ابن حبان:۲،مستدرک حاکم۱،۳۵۰۔۳۵۱

2۔وفات کے وقت اگر کسی کی پیشانی پر پسینہ ہو تو اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "مؤمن کی موت" قرار دیا ہے۔[1]

3۔جمعہ کی رات یا دن کو وفات پانے والے مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنۂ قبر سے حفاظت کی خوشخبری سنائی ہے۔[2]

4۔میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کرنے والوں کے مقام و مرتبہ کا تذکرہ تو قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے: "(۱)انہیں مردہ نہ کہو۔(۲)وہ اللہ کے یہاں رزق دیئے جاتے ہے۔(۳)اللہ کے فضل پر خوش ہوتے ہیں۔(۴)انہیں کوئی خوف ہے نہ ہی کوئی حزن وملال۔(۵)وہ اللہ کی نعمتوں اور اسکے فضل سے مالامال ہوتے ہیں۔" [3]

اسی طرح ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: (۱)خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتے ہی اللہ اسے بخش دیتا ہے اور وہ جنّت میں اپنا مقام دیکھ لیتا ہے۔(۲)وہ عذابِ قبر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔(۳)وہ سب سے بڑے خوف و ہول سے محفوظ ہو جاتا ہے۔(۴)اسے ایمان کا زیور پہنا دیا جاتا ہے۔(۵)اسے حوار العین عطا کر دی جاتی ہیں۔(۶)وہ اپنے رشتہ داروں میں سے ستّر لوگوں کی سفارش کرے گا۔" [4]

جبکہ ایک حدیث میں ہے کہ مؤمنوں میں سے صرف شہید ہی وہ شخص ہے جو فتنۂ قبر

[1]مسندامام احمد۵؍۳۶۰،۳۵۷،ابن حبان: ۷۳۰،مستدرک حاکم۱؍۳۶۱،طیالسی:۸۰۸ معجم طبرانی کبیرواوسط کمافی مجمع الزوائد ۳۲۵؍۲ [2] مسنداحمد:۶۵۸۲-۶۶۴۶،ترمذی ولہٗ شواہد [3] سورۃ البقرہ،آیت:۱۵۴،سورۃ آل عمران،آیت:۱۶۹ [4] ترمذی۱۷؍۳،ابن ماجہ۱۸۴؍۲،مسنداحمد۴؍۱۳۱،۲۲۰

سے دوچار نہیں کیا جائے گا۔[1]

5۔ اللہ کی راہ، میدانِ جہاد میں شہادت پانے والے کے علاوہ اللہ کی راہ میں طبعی موت مر جانے والے کو بھی شہید مانا گیا ہے۔ اسی حدیث میں پیٹ کی بیماری اور پانی میں ڈوب کر مر جانے والے کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہید قرار دیا ہے۔[2]

ایسے ہی جسے اسکا اونٹ یا گھوڑا گرا دے، جسے کوئی زہریلا کیڑا یا جانور ڈنگ مار دے اور اللہ کی راہ میں نکلنے کے بعد وہ چاہے چارپائی پر کسی بھی طرح وفات پا جائے وہ شہید ہے اور اسکے لیے جنت ہے۔[3]

6۔ طاعون (پلیگ) کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی موت قرار دیا ہے۔[4]

ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کو پہلے لوگوں کیلئے عذاب مگر اہلِ ایمان کیلئے رحمت قرار دیا ہے اور اس پر صبر کر کے پڑے رہنے والے کو شہید جتنے اجر و ثواب کی بشارت دی ہے۔[5]

7۔ پیٹ کی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہید شمار فرمایا ہے۔[6]

اور ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص پیٹ کی بیماری کے نتیجہ میں فوت ہو جائے اسے قبر کا عذاب نہیں ہو گا۔[7]

[1]نسائی۱؍۲۸۹ [2] صحیح مسلم ۶؍۵۱،مسند احمد ۲؍۵۲۲،مستدرک حاکم۲؍۱۰۹ وبیہقی۹؍۱۶۶ [3] ابوداؤد۱؍۳۹۱،مستدرک حاکم ۲؍۶۸،بیہقی۹؍۱۶۶ [4] بخاری ۱۰؍۱۵۶-۱۵۷،مسنداحمد۳؍۲۶۵،۲۵۸،۲۲۳،۲۲۰،۱۵۰،طیالسی:۲۱۱۳ [5] بخاری ۱۰؍۱۵۷-۱۵۸،مسنداحمد۶؍۲۵۲،۱۴۵،۶۴،بیہقی۳؍۳۷۶ [6] صحیح مسلم ۶؍۵۱،مسنداحمد ۲؍۵۲۲ [7] ترمذی ۲؍۱۶۰،نسائی۱؍۲۸۹،صحیح ابن حبان:۷۲۸-الموارد،مسنداحمد۴؍۲۶۲،طیالسی:۱۲۸۸

15،16،17۔ اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے یا اپنے ذاتی و جانی دفاع کے دوران مارا جانے والا شخص بھی حدیث کی رو سے شہید ہے۔ اور جو شخص اپنے اہل و عیال کا دفاع کرتے ہوئے وفات پا جائے اسے بھی شہید ہی بتایا گیا ہے۔[1]

18۔ اللہ کی راہ میں ایک دن رات کا رباط و پہرے داری اور دشمن کی تاک میں مورچہ لگائے بیٹھے رہنا مہینہ بھر کے دنوں کے روزے اور راتوں کے قیام سے افضل ہے اور اگر وہ اسی دوران مارا گیا تو اسے اسکے اس عمل کا ثواب قیامت تک پہنچتا رہے گا اور وہ جانچنے والوں (فتنۂ منکر و نکیر) سے محفوظ رہے گا۔[2]

جبکہ معجم طبرانی کی اسی روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی ہیں کہ وہ قیامت کے دن شہید اٹھایا جائے گا۔ لیکن اسکی سند کے بعض راویوں کو امام ہیثمی نے غیر معروف قرار دیا ہے۔[3]

اگرچہ امام منذری نے اسکی سند پر سکوت اختیار کر کے اسکے قابلِ قبول ہونے کا اشارہ دیا ہے۔[4]

ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر شخص کا عمل اسکی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے سوائے اللہ کی راہ میں مورچہ لگائے بیٹھے ہونے کی حالت میں وفات پانے والے کے، اسے قیامت تک ثواب پہنچتا رہتا ہے اور وہ فتنۂ قبر سے بھی محفوظ رہتا ہے۔[5]

19۔ کسی نیک عمل پر وفات پا جانے والا بھی حسنِ خاتمہ والا شمار کیا گیا ہے کہ جس نے رضاء الٰہی کیلئے لا الہ الّا اللہ کہا اور اسی پر اسکا خاتمہ ہوا وہ جنت میں گیا۔ جس نے رضاء الٰہی کیلئے ایک دن کا روزہ رکھا اور اسی پر اسکا خاتمہ ہو گیا تو وہ بھی جنت میں گیا اور جس نے اللہ کی خوشنودی کیلئے صدقہ

[1] ابوداؤد ۲،۲۷۵، ترمذی ۲،۳۱۶، نسائی ۲،۱۷۳-۱۷۴، مسند احمد: ۲۷۸۰، ۱۶۵۳، ۱۶۵۲ [2] مسلم ۶،۵۱، ترمذی ۳،۱۸، نسائی ۲،۶۳ مستدرک حاکم ۲،۸۰، مسند احمد ۵،۴۴۰-۴۴۱ [3] مجمع الزوائد ۵،۲۹۰ [4] الترغیب والترھیب: ۲،۱۵۰ [5] ابوداؤد ۱،۳۹۱، ترمذی ۳،۲، مستدرک حاکم ۲،۱۴۴، مسند احمد ۶،۲۰

کیا اور اسی پر اسکی وفات ہو گئی تو وہ بھی جنت میں داخل ہو گیا۔[1]

خودکشی کی موت:

بعض لوگ اپنی خانگی یا کاروباری پریشانیوں سے دل برداشتہ ہو کر زندگی سے فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھتے ہیں، اپنے معاملات کو سلجھانے اور دکھ میں صبر و ہمّت سے کام لینے کی بجائے وہ انتہائی بزدلانہ فیصلہ کر لیتے ہیں اور کوئی زہریلی چیز کھا کر، گولی چلا کر، پہاڑ سے گر کر، رسّی کے ساتھ لٹک کر، پانی میں ڈوب کر اور تیل چھڑک کر یا اپنے آپ کو آگ کے حوالے کر کے خودکشی کی حرام موت مر جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چلئے جان تو چھوٹ جائے گی حالانکہ:

غم سے گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کر بھی چین نہ ملا تو کدھر جائیں گے؟

خودکشی کی موت تو اپنے آپ کو معمولی سی پریشانی سے نکال کر ایک دردناک اور مسلسل عذاب میں مبتلا کر لینا ہے کیونکہ صحیح بخاری شریف میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَنْ قَتَلَ نَفْسَہٗ بِحَدِیْدَۃٍ عُذِّبَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمْ))[2]

"جس نے لوہے کے کسی ٹکڑے کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کیا اُسے جہنم کی آگ میں اُسی لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔"

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اَلَّذِیْ یَخْنُقُ نَفْسَہٗ یَخْنُقُھَا فِی النَّارِ وَالَّذِیْ یَطْعَنُھَا یَطْعَنُھَا فِی النَّارِ))[3]

"جو شخص اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کرتا ہے وہ جہنم کی آگ میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا اور جو شخص اپنے جسم پر نیزہ وغیرہ مارتا ہے وہ جہنم کی آگ میں بھی اپنے

[1]مسند احمد۵،۳۹۱ [2] بخاری مع الفتح ۳،۲۲۶ [3] بخاری مع الفتح ۳،۲۲۷

آپ کو نیزے وغیرہ سے مارے گا۔"

بخاری و مسلم کی ایک قدرے طویل حدیث میں زہر کھا کر اور پہاڑ سے گر کر خودکشی کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور اس حدیث کے آخر میں مسلم شریف کے الفاظ ہیں:

((فَھُوَ فِی نَارِ جَھَنَّمَ خَالِداً مُخَلَّداً فِیْھَا أَبَداً))[1]

"خودکشی کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ نارِ جہنم میں رہے گا۔" اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ اس سے مراد طویل مدت تک عذاب ہے اور اگر وہ اہلِ توحید میں سے ہو تو اپنی سزا کاٹ لینے پر آخر اُسے جہنم سے نکال ہی دیا جائیگا اور بعض شارحینِ حدیث کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص خودکشی کی موت کو حلال سمجھ کر خودکشی کرے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا اور کافر ہمیشہ کیلئے جہنمی ہے۔[2]

بخاری شریف ہی کی ایک حدیثِ قدسی میں یہ بھی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص زخمی تھا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے خودکشی کر لی تو اللہ تعالیٰ نے (اسکی نسبت) ارشاد فرمایا:

((بَدَرَنِیْ عَبْدِیْ بِنَفْسِہٖ،حَرَّمْتُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ))[3]

"میرے بندے نے اپنی جان لینے کی مجھ سے جلدی کی، میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔"

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ؟:

خودکشی کی موت مرنے والے کی آخرت تو واضح ہوگئی اور اسکی دنیا میں بھی موت خراب ہونے کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صحیح مسلم اور سننِ اربعہ میں حضرت

[1]بخاری مع الفتح ۲۴۷،۱۰و فتح الباری ۲۲۷،۳ [2] حوالۂ سابقہ [3] بخاری مع الفتح ۲۲۷،۳

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ((اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم اُتِیَ بِرَجُلٍ قَدْ قَتَلَ نَفْسَہٗ بِمَشَاقِصَ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْہِ))[1] "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ایسے شخص کی میت لائی گئی جس نے لوہے کے آنکس (یعنی چوڑے تیر) سے خودکشی کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔" نسائی شریف کے الفاظ ہیں:

((أَمَّا أَنَا فَلَا أُصَلِّیْ عَلَیْہِ))[2]

"اسکی نمازِ جنازہ میں تو نہیں پڑھوں گا۔" لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع نہیں فرمایا، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام اوزاعی اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی نمازِ جنازہ عام لوگ تو پڑھ لیں لیکن امام وحاکم، اہلِ علم وفضل اور مقتداء وپیشوا قسم کے اہلِ منصب لوگوں کو اسکی نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیئے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی عبرت ہو۔ علاّمہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔[3]

جبکہ دوسرے آئمہ وفقہاء کے نزدیک اسکی بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

لاَ اِلٰہَ اِلاَّاللہ کی تلقین:

جو شخص قریبِ مرگ ہو، اس پر عالَمِ نزع یا جان کنی کا وقت ہو، اُسے کلمۂ توحید لاَ اِلٰہَ اِلاَّاللہ کی تلقین کرنا چاہیئے کیونکہ صحیح مسلم، سننِ اربعہ اور مسند احمد وبیہقی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

[1]فتح الباری مع التعلیق ۲۲۷،۳،مسلم بتحقیق محمد فواد عبدالباقی ۶۷۲،۲ حدیث(۹۷۸)،ترمذی مع التحفہ ۱۷۷،۴،ابوداؤد مع العون ۴۷۳-۷۲،۸،بلوغ المرام مع سبل السلام ۹۹،۲،۱ [2] حوالۂ سابقہ،ازفتح الباری،بلوغ المرام۔ [3] کتاب الجنائز للمبارکفوری ۶۹،۷۰،تحفۃ الاحوذی ۱۷۸،۴،۱۷۹

((لَقِّنُوْا مَوْتَاکُمْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہَ))[1]

"اپنے قریبِ مرگ لوگوں کو لاَ اِلٰہَ اِلاَّاللہ پڑھنے کی تلقین کرو۔" کیونکہ ابوداؤد، ابن حبان، ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِہٖ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ،دَخَلَ الْجَنَّۃَ))[2]

"جسکی زبان سے نکلنے والے آخری الفاظ لاَ اِلٰہَ اِلاَّاللّٰہُ ہوگئے وہ(بالآخر)جنت میں داخل ہو جائے گا۔"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قریبِ مرگ کو اچھے طریقے سے کلمۂ توحید کی تلقین کی جائے لیکن اس کا اُس پر زور نہ دیا جائے تا کہ اپنی تکلیف و گھبراہٹ کی وجہ سے وہ دل میں اسے ناپسند نہ کرنے لگے یا اس کی زبان سے کوئی نازیبا بات(یعنی کلمے کا انکار)نہ نکل جائے۔[3]

ابوداؤد،نسائی،ابن ماجہ اور مسند احمد میں ایسے شخص کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے کا ذکر آتا ہے مگر محدّثین کے نزدیک وہ روایت ضعیف ہے۔[4]

تجہیز و تکفین اور جنازہ و تدفین میں جلدی کرنا:

حدیث شریف میں اس بات کی بڑی تاکید آئی ہے کہ جب کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس کی تجہیز و تکفین اور جنازہ و تدفین میں جلدی کی جائے اس میں بلاوجہ تاخیر کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اگرچہ بظاہر تو یہ جفا معلوم ہوتی ہے مگر در حقیقت یہ وفاء ہے مثلاً مرنے والا نیک آدمی ہے تو اسے جلد از جلد اللہ کی نعمتوں کی طرف روانہ کر دینا ہی اسکے لیے بہتر ہے،ہاں اگر وہ

[1]مسلم مع النووی ۳،۶،۲۱۹،ابوداؤد مع العون ۸،۳۸۶،ترمذی مع التحفہ ۴،۵۲الفتح الربانی ۷،۵۵ [2] ابوداؤد مع العون ۸،۳۸۵،ترمذی مع التحفہ۴،۵۵،الفتح الربانی ۷،۵۷،مواردالظمآن حدیث(۷۱۹)و حسنہ شیخ ناصرالدین فی الارواء ۳،۱۴۹-۱۵۰واحکام الجنائز،ص:۳۴، ۱۰ [3] شرح مسلم ۳،۶،۲۱۹ [4] ضعیف الجامع ۱،۳۳۰،احکام الجنائزللالبانی ۱۱،وضعفہ فی الارواء ۳،۵۰-۱۵۲،تحقیق المشکوٰۃ ۱،۵۰۹ ایضاً،سبل السلام ۱،۲،۹۰-۹۱ وقد حسنہٗ البعض کما فی الفتح الربانی ۷،۶۳-۶۴

ایسا نہیں تو بھی اسے اسکے اصل ٹھکانے کی طرف پہنچا دینا اور اس فریضہ سے جلد سبکدوش ہو جانا ہی مناسب ہے اور اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے،چنانچہ ابوداؤد اور طبرانی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی موت کے واقعہ کے ضمن میں ہے:

((---وَعَجِّلُوْا فَاِنَّہٗ لَا یَنْبَغِیْ لِجِیْفَۃِ مُسْلِمٍ اَنْ تُحْبَسَ بَیْنَ ظَھْرَانَیْ اَھْلِہٖ))[1]

"تجہیز و تکفین میں جلدی کرو کیونکہ کسی مسلمان کی میت کو یہ لائق نہیں کی اُسے اسکے گھر والے اپنے مابین روک رکھیں"۔ اسی طرح ترمذی،ابن ماجہ،ابن حبان،مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ہے:

((یَاعَلِیُّ ! ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْھَا:اَلصَّلٰوۃُ اِذَا اَتَتْ وَالْجَنَازَۃُ اِذَا حَضَرَتْ وَالْاَیِّمُ اِذَا وَجَدْتَّ لَھَا کُفْوًا))[2]

"اے علی!تین کاموں کے کرنے میں تاخیر نہ کرو(۱)نماز کی ادائیگی میں جب اسکا وقت ہو جائے(۲)نمازِ جنازہ پڑھنے میں جبکہ موت واقع ہو جائے(۳)جب بیوہ(یا نوجوان کنواری)کے لیے مناسب رشتہ مل جائے تو اسکی شادی کرنے میں۔" ان سب سے بڑھ کر صحیح بخاری و مسلم اور سننِ اربعہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةَ،فَإِنْ تَکُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا إِلَيْهِ،وَإِنْ يَکُ غَيْرَ ذٰلِکَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهٗ عَنْ رِقَابِکُمْ))[3]

[1]ابوداؤد مع العون ۴۳۵،۸ وقد تکلّم علیہ الشوکانی جرحاًَ وتعدیلاًَ فی النیل ۲۳-۲۲،۴،۲ و حسنہ الحافظ فی الفتح ۱۸۴،۳ وضعفہ شیخ ناصرالدین فی المشکوٰۃ ۵۱۰،۱ [2] الفتح الربانی ۹۹،۷،النیل ۲۳،۴،۲،ترمذی مع التحفہ ۱۹۰-۱۸۹،۴،ضعفہ شیخ ناصرالدین فی تحقیق المشکوٰۃ ۱۹۲،۱،و ضیعف الجامع ۶۰،۳،۲ [3] بخاری مع الفتح ۱۸۳،۳،ترمذی مع التحفہ ۹۵-۹۴،۴

"جنازہ لے جانے میں جلدی کرو، کیونکہ وہ نیک آدمی کا ہو گا تو اسے تم اجر و نعمت کی طرف لیجاتے ہو اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم شرّ سے اپنی گردن خلاصی کراتے ہو۔"

میت کو غسل دینا :

میت کی تجہیز و تکفین اور جنازہ و تدفین کا پہلا مرحلہ اُسے غسل دینا ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو سوائے بعض مالکی فقہاء کے سب کے نزدیک اُسے غسل دینا "فرض کفایہ" ہے اور امام نووی، ابن قدامہ اور فتح القدیر شرح ہدایہ کے مؤلف امام ابن الہمام نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے اور شارح بخاری حافظ ابن حجر نے بعض مالکیہ کا تذکرہ کیا ہے جو غسلِ میّت کو سنت قرار دیتے ہیں، اور امام قرطبی نے اپنی شرح مسلم میں غسلِ میت کے سنت ہونے کو ہی ترجیح دی ہے لیکن جمہور اہل علم وجوب کے قائل ہیں۔[1]

شہید کا حکم :

جو مسلمان کفار و مشرکین سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں انہیں تو غُسل دیئے بغیر ہی انکے خون آلود کپڑوں سمیت دفن کیا جائے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غسل دینے سے منع کیا ہے اور اسکی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احد میں شہید ہوئے، انکے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
((اِدْفِنُوْهُمْ فِی دِمَائِهِمْ يَعْنِیْ يَوْمَ أُحُدٍ۔وَلَمْ يُغْسِلْهُمْ))[2]

"ان شہداء اُحد کو ان کے خون آلود کپڑوں میں ہی دفن کر دو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غسل بھی نہیں دیا تھا۔"

[1]تفصیل کیلئے دیکھیئے فتح الباری ۱۲۶-۲۵،۳،الفتح الربانی ۱۵۵،۷،فتح القدیر شرح ہدایہ ۴۴۷،۱ [2] بخاری مع الفتح ۲۱۲،۳

یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں جبکہ مسند احمد میں ہے:

((لَا تُغْسِلُوْهُمْ فَإِنَّ کُلَّ جُرْحٍ أَوْ کُلَّ دَمٍ يَفُوْحُ مِسْکاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[1]

"انہیں غسل نہ دو، اسلئے کہ قیامت کے دن ان کے زخم یا ان کے خون کستوری کی خوشبو جیسے مہکیں گے"..... الخ اِس اور ایسی ہی دیگر احادیث کی بنا پر تمام اہلِ علم اور چاروں آئمہ شہید کو غسل نہ دینے کے قائل ہیں، البتہ جنابت یا حیض والے شہید کے غسل میں اکثر آئمہ کی رائے تو غسل نہ دینے کی ہی ہے اور دلائل کے عموم کی وجہ سے امام شوکانیؒ نے اسے ہی حق قرار دیا ہے اور آئمہ میں سے امام شافعی، مالک، ابو یوسف اور محمد کے نزدیک تو غسل نہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک غسل دیا جائیگا۔[2]

غسلِ میّت کا حقدار:

میت کو غسل وہ دے جس کا تعلق میت کے ساتھ سب سے زیادہ قریبی ہو، ہاں اگر وہ غسل دینے کا طریقہ نہ جانتا ہو تو کوئی بھی مسلمان غسل دے سکتا ہے بشر طیکہ غسل دینے والا پرہیز گار اور امانت دار ہو۔ یہ بات مسند احمد اور طبرانی اوسط میں مذکور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتی ہے اور اُسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ جس شخص نے کسی میّت کو غسل دیا اور امانت داری و حکمِ شریعت کے مطابق غُسل دیا اور اگر اُسے میّت سے کوئی ناپسندیدہ بات معلوم ہوئی تو اُسے ظاہر نہ کیا تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے اُس کی ماں نے آج ہی اُسے جنم دیا ہو۔[3]

[1]الفتح الربانی ۷،۱۵۹،ابو داؤد مع العون ۸،۸،۴۱۲-۴۰۷،ترمذی مع التحفہ۴،۱۲۶ [2] نیل الاوطار ۲،۴،۲۹-۳۰ [3] الفتح الربانی ۷،۱۵۳،نیل الاوطار ۲،۴،۲۵،وقد قواہ الحافظ فی الدرایۃ ۱۴۰ وفی سند ہ جابر الجعفی وقدثبت)

جبکہ مستدرک حاکم (۱/ ۳۶۲،۳۵۴)اور سنن کبریٰ بیہقی (۳/ ۳۹۵)میں حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
((مَنْ غَسَلَ مُسْلِماً فَکَتَمَ عَلَیْہِ غَفَرَ لَہٗ اللّٰہُ اَرْبَعِیْنَ مَرَّۃٍ.....))

"جس نے کسی مسلمان میّت کو غسل دیا اور اسکی پردہ پوشی کی اسے اللہ تعالیٰ چالیس مرتبہ بخشے گا۔" اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور علّامہ ذہبی والبانی نے ان سے موافقت کی ہے۔ جبکہ معجم طبرانی کبیر میں ((اربعین مرۃ)) کی بجائے ((اربعین کبیرۃ)) ہے کہ "اسکے چالیس کبیرہ گناہ بخش دیتا ہے۔" اس حدیث کی سند کے بارے میں امام منذری نے الترغیب والترغیب (۴/ ۱۷۱) میں اور امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے قابلِ حجت راوی ہیں اور حافظ ابن حجر نے الدرایۃ (۱۴۰) میں اس کی سند کو قوّی قرار دیا ہے۔[1]

بچے کی میّت کو غسل دینا:

چھوٹی عمر کے لڑکے کو عورتوں کے اور لڑکی کو مردوں کے غسل دینے کے جواز پر تو سب آئمہ وفقہاء کا اتفاق ہے لیکن چھوٹی عمر کی تعیین میں آئمہ کے مختلف اقوال ہیں، امام احمد کے نزدیک سات سال، امام اوزاعی کے نزدیک چار پانچ سال اور حضرت حسن بصری کے نزدیک ڈھائی تین سال ہے اور احناف کے نزدیک عورتیں صرف ایسے لڑکے کو غسل دے سکتی ہیں جو ابھی بات نہ کرنے لگا ہو۔[2]

[1]الاجر فی عدۃ احادیث انظر ھافی الجنائزللالبانی ۵۱۔۵۲ دیکھیے:احکام الجنائز للالبانی،ص ۵۱ [2] المغنی لابن قدامہ ۴۳۸٫۲،المجموع ۱۲۰٫۵،المقنع ۲۷۲٫۱

غسلِ میّت یاصرف تیمّم؟:

اگر کوئی عورت کسی ایسی جگہ وفات پاجائے جہاں دوسری کوئی عورت نہ ہو جو اُسے غسل دے نہ اسکا کوئی محرم رشتہ دار وہاں موجود ہو اور نہ ہی اسکا شوہر ہو تو ایسی حالت میں اُس عورت کو غسل نہیں دیا جائے گا بلکہ محض تیمم کرایا جائے گا۔اِسی طرح اگر کوئی مرد فوت ہو جائے اور وہاں عورتوں کے سوا کوئی نہ ہو تو اس مرد کو بھی غسل کی بجائے صرف تیمّم ہی کرایا جائے گا چنانچہ مراسیل ابی داؤد میں حضرت مکحول رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی عورت مر جائے اور وہاں مردوں کے سوا کوئی (عورت) نہ ہو اور جب کوئی مرد فوت ہو جائے اور وہاں عورتوں کے سوا کوئی (مرد) نہ ہو تو ایسے مرد اور عورت کو تیمم کرایا جائے۔(اور جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے وہ دونوں ایسے شخص کی مانند ہیں جس کو وضوء و غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم کر لیتا ہے)۔[1]

حضرت سعید بن مسیّب، امام نخعی و حمّاد، ابو حنیفہ و مالک، احمد اور تمام علمائے حدیث کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر یہی تیمم ان کے لیے غسل کے قائمقام ہو جائے گا لیکن امام حسن بصری، اسحاق بن راہویہ اور امام شافعی کے نزدیک مرسل حدیث قابلِ حجت نہیں ہوتی لہٰذا انکا کہنا ہے کہ ایسے مرد یا عورت کو کپڑوں سمیت غسل دے دیا جائے گا اور غسل دینے والا مرد ہو یا عورت وہ اپنے ہاتھوں کو بھی کپڑے کے ٹکڑے سے لپیٹ کر غسل دیں گے۔[2]

ولدِ زنا کو بھی وجوباً غسل دیا جائے گا اور اسکی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، جمہور علماء وفقہاء اور آئمہ کا یہی مسلک ہے۔[3]

[1]مراسیل ابی داؤد بحوالہ المغنی لابن قدامہ ۴۳۸٫۲،فقہ السنہ ۵۱۶٫۱ [2] المغنی ۴۳۸۔۳۷٫۲ و کتاب الجنائز[علّامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی] ص ۲۳،فقہ السنہ ۵۱۶٫۱ المقنع ۲۷۲٫۱،المجموع شرح المہذب للنووی ۱۱۵٫۵ [3] الفتح الربانی ۱۶۳٫۷ عن المجموع شرح المہذّب للنووی

مشہور حنفی عالم علّامہ ابنِ ہمام لکھتے ہیں کہ میت کے غسل پر اجرت لینا منع ہے۔[1]

بیوی کا خاوند کو اور خاوند کا بیوی کو غسل دینا:

عام طریقہ تو یہی ہے کہ اگر کوئی مرد وفات پا جائے تو اُسے مرد ہی غسل دیتے ہیں اور عورت کو عورتیں، لیکن میاں بیوی کا معاملہ الگ ہے کسی جگہ مسائلِ دین سے ناواقفیت کی بناء پر ماحول اِسکی اجازت نہ دے رہا ہو یا پھر شرم وحیاء کا اپنا بنایا ہوا پیمانہ اسکے مانع آجائے تو الگ بات ہے اور ویسے بھی یہ کوئی واجب تو نہیں البتہ اس بات کے جائز ہونے پر تمام صحابہ و تابعین اور آئمہ وفقہا کا اتفاق ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی وفات پر اُسے غسل دے سکتی ہے۔

بیوی کے اپنے شوہر کو غسل دینے کے دلائلِ جواز:

1۔ ابو داؤد، بیہقی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتی تھیں:

((لَوْ اِسْتَقْبَلْتُ مِنَ الْأَمْرِ مَااسْتَدْ بَرْتُ،مَا غَسَلَ رَسُوْلَ اللهِ اِلاَّ نِسَاؤُهٗ))[2]

"جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی ہے اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہی غسل دیتیں۔" 2۔ اِسی طرح متعدد آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس بات کی تائید ہوتی ہے مثلاً یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے خود انہیں غسل دیا تھا۔[3] 3۔ حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ نے وصیّت فرمائی تھی کہ انکی بیوی انہیں غسل دے۔

[1]فتح القدیرشرح ہدایہ ۱،۴۵۲ طبع دار صادر بیروت [2] ابوداؤد مع العون ۸،۴۱۵،الفتح الربانی ۷،۱۵۷،حسنہ شیخ ناصرالدین فی الارواء ۳،۱۶۳-۱۶۲ [3] نیل الاوطار ۱،۱،۲۳۹ و ۳،۴،۲۷،الفتح الربانی ۷،۱۵۷،المجموع شرح المہذب ۵،۱۹۰

4۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی نے ہی غسل دیا تھا۔[1]

معروف فقیہہ علاّمہ ابن قدامہ نے ابن المنذر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیوی کے اپنے شوہر کو غسل دینے کے جواز پر تمام (صحابہ و تابعین، آئمہ وفقہاء اور جمیع اہلِ علم کا) اجماع ہے، اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[2]

شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے کے دلائلِ جواز:

اِسی طرح امام مالک، شافعی، مشہور روایت میں امام احمد، عام محدّثین اور جمہور اہلِ علم کے نزدیک شوہر بھی اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ ان سب کا 1۔ ستدلال متعدد احادیث سے ہے مثلاً:

1۔ ابن ماجہ (باب ماجاء فی غسل الرجل لمرأتہ و غسل المرأۃ زوجہا)، مسند احمد، ابن حبان، دار قطنی، بیہقی اور سنن دارمی میں ایک حدیث ہے جسے صاحب منتقی الاخبار نے باب ماجاء فی غسل احد الزوجین للآخر میں ذکر کیا ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:
((مَا ضَرَّكِ لَوْ مِتِّ قَبْلِیْ فَغَسَّلْتُكِ وَكَفَّنْتُكِ ثُمَّ صَلَّیْتُ عَلَیْكِ وَدَفَنْتُكِ))[3]

"تم اگر مجھ سے پہلے وفات پا گئیں تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا کیونکہ میں خود تمہیں غُسل دوں گا، کفن پہناؤں گا پھر تمہاری نمازِ جنازہ پڑھوں گا اور تمہیں دفن کرونگا۔"

[1]النیل ۲،۴،۲۷ [2] حسنہ الشوکانی فی النیل ۲،۴،۲۷و الحافظ فی التلحیض ۱۷۰،وشیخ ناصرالدین فی الارواء ۳،۱۶۲ مصنّف عبدالرزاق ۳،۱۶۳ [3] المغنی ۲،۴۳۶ [4] ا لمغنی ۲،۴۳۶،ارواء الغلیل ۳،۱۶۲ و حسنہ شیخ ناصرالدین [5] بیہقی۳،۴۰۹،المحلّی۵،۱۷۴ [6] بیہقی ۳ ،۴۰۹،مصنف عبدالرزاق۳،۴۰۹،المحلّی ۵،۱۷۴

2۔ اِسی طرح مسند شافعی، سنن دار قطنی، مستدرک حاکم اور بیہقی میں مذکور ہے کہ جب حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو انکے شوہرِ نامدار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنہیں غُسل دیا تھا۔[2] امام ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں معروف تھی مگر کسی نے ان پر نکیر نہیں کی لہٰذا یہ ان سب کی طرف سے اس کے جواز پر اجماع ہوا۔[3]

3۔ مستدرک حاکم و بیہقی میں ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہما (زوجۂ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) فرماتی ہیں:

((غَسَّلْتُ اَنَا وَ عَلِیٌّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ رَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم))[4]

"جب حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو میں نے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل دیا تھا۔" 4۔ حضرت عبد الرحمن بن اسود رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو غسل دیا۔[5]

5۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (اَلرَّجُلُ اَحَقُّ بِغُسْلِ اِمْرَأَتِہٖ) "مرد اپنی بیوہ کو غسل دینے کا زیادہ حقدار ہے۔" [6]

اسی طرح تابعین کرام میں سے بھی متعدد اہل علم کے اس جواز کے فتاویٰ موجود ہیں مثلاً:

[1]النیل ۲،۴،۲۷ [2] حسنہ الشوکانی فی النیل ۲،۴،۲۷و الحافظ فی التلحیض ۱۷۰،وشیخ ناصرالدین فی الارواء ۳،۱۶۲ مصنّف عبدالرزاق ۳،۱۶۳ [3] المغنی ۲،۴۳۶ [4] ا لمغنی ۲،۴۳۶،ارواء الغلیل ۳،۱۶۲ و حسنہ شیخ ناصرالدین [5] بیہقی۳،۴۰۹،المحلّی۵،۱۷۴ [6] بیہقی ۳ ،۴۰۹،مصنف عبدالرزاق۳،۴۰۹،المحلّی ۵،۱۷۴

(۱) حضرت حسن بصری۔ (۲) حضرت حماد بن ابی سلیمان۔ (۳) حضرت ابو الشعثاء جابر بن زید۔ (۴) حضرت سلیمان بن موسیٰ۔ (۵) حضرت قسامہ بن زید۔ (۶) حضرت عطاء بن ابی رباح۔[1] (۷) حضرت علقمہ۔ (۸) حضرت ابو لامہ رحمہم اللہ[2]

قائلینِ جواز آئمہ و جمہور اہلِ علم کا کہنا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ انتہائی قریبی ہوتا ہے اور زندگی بھر ان میں جو باہمی قُرب و محبت رہی ہوتی ہے اُسی کے نتیجہ میں جس قدر عمدگی سے وہ دونوں ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں یہ کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

مانعین کے دلائل اور انکا جائزہ:

بیوی کے اپنے شوہر کو غسل دینے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے تاہم امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری اور ایک غیر مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک موت واقع ہو جانے کے بعد شوہر کا اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں۔ جبکہ مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ سمیت تین آئمہ جواز

کے قائل ہیں اور صرف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ عدم جواز کی طرف گئے ہیں اور بیوی کے اپنے شوہر کو غسل دینے کے سلسلہ میں تو امام صاحب بھی جواز کے ہی قائل ہیں۔

احناف کا کہنا ہے کہ شوہر کے وفات پاجانے سے عدّت کے (چار ماہ دس) دن پورے ہونے تک بیوی اسکے لیے محرم ہوتی اور اس کی زوجیت میں رہتی ہے لہٰذا وہ شوہر کو غسل دے سکتی ہے اس کے برعکس بیوی کا انتقال ہو جانے کے بعد وہ اپنے شوہر کیلئے محرم نہیں رہتی لہٰذا اس کا اُس کی طرف دیکھنا اور اُسے چھُونا تک جائز نہیں۔[3]

جواز پر دلالت کرنے والی احادیث و آثار کی تأویل کرتے ہوئے یہ جواب دیا جاتا

[1]المحلّٰی ۱۷۵٫۵،مصنف عبدالرزاق ۴۰۹٫۳تا ۴۱۱ [2] بیہقی ۳۹۷٫۳ [3] الفتح الربانی ۱۵۷٫۷،المغنی ۴۳۶٫۲،وانظرردالشوکانی علیہ فی النیل ۲۷٫۴٫۲،و کذٰلک رد النووی فی المجموع شرح المہذب ۱۱۴٫۵ و ۱۱۹٫۵

ہے کہ جس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے ہیں کہ "میں تمہیں غسل دیتا۔" اس سے مراد یہ ہے کہ میں تمہارے غسل کا انتظام کرتا،اور جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دینے کا ذکر ہے،وہ اُسے صحیح نہیں مانتے کیونکہ دوسری روایت میں حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا کا غسل دینا ذکر ہوا ہے۔اس سے مستدرک حاکم و بیہقی کی اس روایت کی طرف اشارہ مقصود ہے جس میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ " حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا۔" اِس روایت سے معلوم ہوا کہ اکیلی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ہی نے غسل نہیں دیا بلکہ ان کے بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔[1] علمائے احناف کا کہنا ہے کہ اگر اس واقعہ کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی اسے اس لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے اِس فعل پر تنقید کی تھی حتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہنا پڑا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ " فاطمہ رضی اللہ عنہما دنیا میں بھی تمہاری بیوی ہے اور آخرت میں بھی"،ان کا یہ کہنا گویا اِس بات کی دلیل ہے کہ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جانا پہچانا طریقہ یہی تھا کہ شوہر اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا۔[2]

جبکہ دوسرے آئمہ حتی کہ خود بعض کبار علمائے احناف مثلاً امام طحاوی اور علاّمہ عینی اس روایت کو صحیح نہیں مانتے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دنیا و آخرت دو جہان میں ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں یعنی یہ کہ انتقال کے بعد بھی انکا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح باقی رہا،اس روایت کے غلط و غیر صحیح ہونے کی ٹھوس دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد (انہی کی وصیّت پر عمل کرتے ہوئے) انکی سگی بھانجی حضرت اُمامہ بنت زینب رضی اللہ عنہما کے

[1]دیکھیے تخریج ۴۸ [2] بذل المجہود ۱۰۹٫۱۴-۱۱۰ وفیہ ام ایمن بدل اسماء

ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کیوں کر لیا تھا؟ اگر دونوں جہانوں میں بیوی ہونے والی روایت صحیح ہوتی تو وہ یہ نکاح نہ کرتے، کیونکہ خالہ اور بھانجی کو بیک وقت نکاح میں لینا حرام ہے۔[1]

مرنے والی کے وفات کے ساتھ ہی اپنے شوہر کے نکاح سے نکل جانے والی بات معروف ہے جبکہ قرآن کی رو سے یہ درست نہیں بلکہ قرآنِ کریم نے اسے زوجہ (بیوی) ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء، آیت: ۱۲ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾

"تمہارے لیے تمہاری بیویوں کے ترکہ میں سے آدھا ہے بشرطیکہ انکی اولاد نہ ہو۔" جانبین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جمہور کے دلائل زیادہ قوی ہیں لہٰذا انتقال کے بعد بھی بیوی کی میت اپنے شوہر کیلئے غیر محرم نہیں ہو جاتی، اُسکا اُسے دیکھنا یا چھُونا اور غسل دینا جائز ہے۔

غیر معروف لاش یا چند ٹکڑوں کا حکم :

اگر کوئی اپنے گھر یا ہسپتال میں وفات پا جائے تو وہ جانا پہچانا ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کی لاش کسی ویران جگہ پر پائی گئی اور قُرب وجوار کے لوگوں میں سے اُسے جانتا بھی کوئی نہ ہو اور اُس لاوارث کے بارے میں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ کسی مسلمان کی نعش ہے یا کافر کی، ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟ اس سوال کا جواب فقہ حنفی کی معتبر کتاب "ہدایہ" کی شرح فتح القدیر میں علّامہ ابن ہمام نے یہ لکھا ہے کہ وہ لاش مسلمانوں کے دیہات میں سے کسی گاؤں میں پائی جائے اور اس پر مسلمانوں والی کچھ علامات اور نشانیاں بھی پائی جائیں تو اُسے غسل دے کر اُسکی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور اگر وہ کہیں کفار کی آبادیوں (کے قُرب وجوار) میں پائی گئی ہو اور اس میں

[1]تفصیل کیلئے دیکھیئے احکام الجنائز للمبارکپوری ص:۲۴

مسلمانوں والی کوئی نشانی بھی نہ پائی جاتی ہو تو اس کا (غسل نہیں اور) جنازہ بھی نہیں پڑھا جائے گا، ایسے ہی اگر کسی حادثہ کا شکار ہونے والے شخص کے جسم کے صرف بعض اعضاء ہی ملیں تو اُس پر غسل وجنازہ نہیں، ہاں اگر جسم کا نصف سے زیادہ حصہ یکجا مل جائے تو اس کو غسل دیا جائے گا اور اس کا جنازہ پڑھا جائیگا اور اگر جسم کا اوپر والا آدھا حصہ سَر سمیت ملے تو (بالاولیٰ) اسکا غسل وجنازہ ہو گا۔[1]

جبکہ شافعیہ کے نزدیک محض اعضائے جسم کے ملنے پر بھی غسل وجنازہ ہے اور اس سلسلہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات موجود ہیں۔[2]

غسلِ میّت اور ہماری حالت:

عام میت کو غسل دینے کے سلسلہ میں یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جو اُسکا سب سے زیادہ قریبی ہو وہ غسل دے لیکن ہمارا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے کہ جزع وفزع، رونے دھونے، نوحہ وبَین اور دیگر غیر اسلامی رسوم کے ذریعے ہم مرنے والے سے اپنی انتہائی محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب غسل دینے کا موقع آتا ہے تو پھر مَرد کی میّت کیلئے "میاں جی" اور عورت کیلئے میاں جی کی اہلیہ "بی بی جی" کے محتاج ہو جاتے ہیں اور اب تو مسلمان ملکوں میں ایسے ادارے بھی قائم ہو گئے ہیں جو معاوضہ لے کر میّت کے غسل کی ذمہ داری نبھا جاتے ہیں، جبکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اس فریضہ کو خود ادا تو کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے طریقہ سے ناواقف ہوتے ہیں حالانکہ یہ غسل اور کفن ودفن ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہے جیسا کہ

زوائد مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مصنف عبدالرزاق و نصب الرایہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتوں نے انہیں غسل دیا، کفنایا، خوشبو لگائی، لحد والی قبر کھودی، انکی نمازِ جنازہ پڑھی پھر انکی قبر میں داخل ہو کر

[1]فتح القدير ۱٫۴۵۲ [2] المجموع ۵٫۲۱۰

انہیں قبر میں رکھا اور لحد کو اینٹوں سے بند کیا پھر قبر سے باہر آکر مٹی ڈال دی اور کہا:

((يَا بَنِيْ آدَمَ ! هَذِهِ سُنَّتُكُمْ))[1]

"اے بنی آدم! تمہارے لئے (میّت کو دفنانے کا) یہ طریقہ ہے۔"

غسلِ میّت کا مسنون طریقہ:

میّت کو غسل دینے کا طریقہ بتانے والی سب سے صحیح اور مشہور حدیث حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس پر تمام آئمہ کا عمل ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد و بیہقی میں وہ فرماتی ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو غسل دے رہی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "

اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے تین، پانچ یا اس سے زیادہ مرتبہ غسل دو اور آخری غسل میں تھوڑا سا کافور بھی مِلا لو اور جب تم غسل سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے اطلاع دو۔"

چنانچہ ہم نے غسل سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اپنی باندھنے والی چادر پھینکی اور فرمایا: "اس سے اس کا جسم لپیٹ دو (یعنی اس کا کفن بنادو)۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: "

جسم کے دائیں اعضاء سے اور وضوء کی جگہوں سے غسل دینا شروع کرو۔"

اور حضرت ام عطیّہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے سر میں کنگھی کی اور بالوں کی تین چوٹیاں بنادیں، ان میں سے دو سَر کے دائیں اور بائیں حصہ کے بالوں کی تھیں اور ایک پیشانی کے بالوں کی، اور بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ سَر کے بالوں کی چوٹیاں بنا کر وہ ہم نے پیچھے کمر پر ڈال دیں۔[2]

[1]نیل الاوطار ۲،۴،۲۵،مصنّف عبدالرزاق۳،۴۰۰،الفتح الربانی۷،۱۵۴ [2] بخاری مع الفتح ۳،۱۳۵-۱۳۴،ابوداؤد مع العون ۸،۴۱۶-۴۲۲،ترمذی مع تحفہ الاحوذی۴،۶۴-۶۷،نیل الاوطار ۲،۴،۳۱

صحاح و سنن میں مذکور ان احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ غسل میّت کے جسم کے دائیں اعضاء سے اور وضوء کی جگہوں سے شروع کرنا چاہیئے اور جس پانی سے غسل دیا جائے اُس میں بیری کے پتے ملائے جائیں، تین، پانچ اور بوقتِ ضرورت اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دیا جائے مگر طاق مرتبہ ہو جیسا کہ مذکورہ حدیث کے الفاظ تین یا پانچ سے پتہ چلتا ہے اور بخاری شریف میں ہی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی یہی مذکور ہے۔[1] آخری غسل میں کافور کا استعمال کیا جائے۔ عورت کے سَر کے بالوں کو کھول کر دھویا جائے انہیں کنگھا کیا جائے اور تین چوٹیاں بنا کر انہیں سر کے پیچھے کمر پر ڈال دیا جائے۔ مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور تمام محدّثینِ کرام کا مسلک تو یہی ہے جبکہ احناف کے نزدیک عورت کے بالوں کو دونوں کندھوں کے اوپر سے سینے پر ڈال دینا مستحب ہے۔[2]

انکا کہنا ہے کہ چوٹیاں بنانا اور پیچھے ڈال دینا حضرت ام عطیّہ رضی اللہ عنہا کا اپنا عمل ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے کا حکم فرمایا تھا اور دوسرے آئمہ وفقہاء اور محدّثین کا کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس بات کی اطلاع تھی جسکا ثبوت سنن سعید بن منصور کی حدیث میں ہے جس میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا تھا کہ ہم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بالوں کی چوٹیاں بنادیں اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تین چوٹیاں بنانے کا حکم فرمایا تھا، لہذا بات واضح ہو گئی کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے عمل کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف یہ کہ خبر تھی بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہی ہوا تھا۔[3]

غسلِ میت کے سلسلہ میں بعض فقہی تشریحات:

آئمہ وفقہاء نے طریقۂ غسل کی مزید وضاحت کی ہے کہ پانی کو نیم گرم کر لیا جائے اور بیری کے پتے ڈالنے کی سنت پوری کرنے کے ساتھ ہی صابن سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے،

[1]بخاری مع الفتح ۳،۱۳۰ [2] بذل المجہود ۱۴،۱۱۲-۱۱۳ [3] فتح الباری ۳،۱۳۴،تحفۃ الاحوذی ۴،۶۶،نیل الاوطار ۲،۴،۳۲،الفتح الربانی۷،۱۶۸

جائے غسل میں خوشبو کا انتظام کر لیا جائے تا کہ میت کے پیٹ سے کچھ خارج ہونے کی شکل میں بدبو نہ پھیلے اور میّت کو کسی بلند جگہ یعنی تخت پر لٹا لیا جائے۔[1]

میت کا لباس اتار کر صرف شرمگاہ پر کپڑا رہنے دیا جائے اور وہ جگہ جہاں غُسل کا اہتمام کیا گیا ہو وہ دوسرے لوگوں سے باپردہ ہو، شروع میں نرمی کے ساتھ میّت کے پیٹ کو دبایا جائے تا کہ اگر کوئی فُضلہ پہلے ہی نکل جائے تو اچھا ہے، میّت عورت کی ہو تو غسل دینے والی اسکے کوائف کے مطابق جیسے مناسب سمجھے کر لے۔ نہلانے والا اپنے ہاتھ پر کپڑے کی تھیلی چڑھا کر میّت کو اچھی طرح استنجاء کرائے اور پھر ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق دائیں اعضاء کی وضوء کی جگہوں سے غسل دینے کا آغاز کرے۔ پہلے وضوء کرائے لیکن کلی کیلئے مُنہ میں اور ناک میں پانی نہ ڈالے تا کہ یہ پانی میّت کے پیٹ میں اتر کر خرابی کا باعث نہ بنے لہٰذا کپڑے یا روئی کو گیلا کر کے پہلے دانتوں کو اور پھر ناک کو صاف کرے۔ وضوء کروانے کے بعد پہلے بائیں پہلو پر

لٹا کر اسکے دائیں پہلو پر پانی بہائے اور سَر سے پاؤں تک صابن لگا کر صفائی کرے پھر دائیں پہلو پر لٹا کر بائیں پہلو کی صفائی کرے اور بالوں کو اچھی طرح دھویا جائے اور خوشبو لگائی جائے یہ ایک مرتبہ غسل ہو گیا۔ اسی طرح تین، پانچ یا سات مرتبہ نہلایا جائے اور عورت کے بالوں کی تین چوٹیاں بنا کر پیچھے ڈال دی جائیں پھر صاف کپڑے سے جسم کو پونچھ دیا جائے، آخر میں کافور یا کوئی بھی اچھی سی خوشبو لگا دی جائے اور یہ اعضائے سجدہ پر بطورِ خاص لگائی جائے ویسے اگر سارے جسم پر بھی کافور لگا دیا جائے تو اچھا رہتا ہے۔ عام خوشبو کی نسبت کافور کا یہ خاصہ ہے کہ ایک تو یہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور میت کو جلد خراب ہونے سے بچاتا ہے، دوسرے یہ ایسی خوشبو ہے کہ کیڑے مکوڑے میّت کے قریب جلدی نہیں آتے، کافور لگ جانے کے بعد میت کفنانے کیلئے تیار ہو جاتی ہے اور علاّمہ ابن حزم کے سوا جمہور علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ

[1]فقہ السنہ ۱،۵۱۵

میت کے ناخن نہ تراشے جائیں اور نہ ہی کوئی زائد بال صاف کئے جائیں اور غسل دینے لیکن کفنانے سے پہلے ہی اگر میت کے پیٹ سے کوئی فضلہ وغیرہ نکلے تو احناف، شافعیہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک صرف صفائی کر دی جائے دوبارہ غسل کرانے کی ضرورت نہیں۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ دوبارہ غسل دیا جائے جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ صرف وضوء دوبارہ کرا دیا جائے۔[1]

مُحرم کا غسل:

کوئی شخص سفرِ حج میں احرام کی حالت میں وفات پا جائے تو اُسے غسل دیا جائے مگر خوشبو نہ لگائی جائے اور نہ ہی اسکا سَر ڈھانپا جائے بلکہ اُسے احرام کے اُنہی دو کپڑوں میں کفن دے دیا جائے کیونکہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہے کہ میدانِ عرفات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وقوف کے دوران ایک شخص اپنی سواری سے گرا تو گردن ٹوٹ جانے سے وہ فوت ہو گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات لائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " اسے بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دو اور اسے اسکے (احرام والے) دو کپڑوں میں ہی کفن دے دو اور اسے کوئی خوشبو وغیرہ نہ لگاؤ اور نہ ہی اس کے سَر کو ڈھانپو۔"

((فَإِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّياً))[2]

" یہ قیامت کے دن لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ پکارتا ہوا اٹھایا جائے گا۔" احناف و مالکیہ کے نزدیک اُسے بھی عام میّت کی طرح ہی غسل و کفن دیا جائے گا، ان کے نزدیک اسکا احرام موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا مگر مذکورہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اسکے برعکس ہے۔[3]

[1]فقہ السنہ ۱،۵۱۰-۵۱۵،فتح القدیر شرح ہدایہ ۱،۴۴۷-۴۵۱،المغنی ۲،۳۷۸-۳۸۶ طبع مصر،الفقہ علیٰ المذاہب الاربعہ ۱،۵۰۹-۵۱۰،المجموع ۵،۲۶ [2] بخاری مع الفتح ۳،۱۳۶،نیل الاوطار ۲،۴،۴۰،الفتح الربانی ۷،۸۸-۱۹۰ [3] تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری ۳،۳۶-۱۳۸،بذل المجہود ۱۴،۲۰۹-۲۱۰ طبع سوم

اِس حکم کو اگر اُس شخص کے ساتھ خاص ماننے کا دعویٰ کیا جائے تو پھر اسکی دلیل چاہیئے۔

غسل دینے والے پر غسل کا استحباب :

وہ شخص جو کسی میّت کو غسل دے اسکے لیے فرض و واجب تو نہیں البتہ مستحب یہ ہے کہ بعد میں وہ خود بھی غسل کر لے کیونکہ ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

((مَنْ غَسَلَ مَيِّتاً فَلْيَغْتَسِلْ وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ))[1]

"جو شخص کسی میّت کو غسل دے اُسے چاہیئے کہ بعد میں خود بھی غسل کرے اور میّت کو اٹھانے والا وضوء کر لے۔"

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شائد غسل دینے والے پر غسل کرنا واجب ہے لیکن اسکا قائل کوئی نہیں اور اس حدیث کے حکم کو وجوب سے استحباب کی طرف لانے والی یہ دو احادیث ہیں:

1۔ پہلی مستدرک حاکم و بیہقی میں ہے جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِيْ غُسْلِ مَيِّتِكُمْ غُسْلٌ اِذَا غَسَلْتُمُوْهُ،فَاِنَّ مَيِّتَكُمْ لَيْسَ بِنَجَسٍ فَحَسْبُكُمْ اَنْ تَغْسِلُوْا اَيْدِيَكُمْ))

" تم پر میّت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنا ضروری نہیں کیونکہ تمہاری وہ میّت کوئی نجس تو نہیں تھی، تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے ہاتھ دھولو۔"

2۔ دوسری حدیث دار قطنی اور تاریخ بغداد میں ہے جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((كُنَّا نُغْسِلُ الْمَيِّتَ فَمِنَّا مَنْ يَّغْتَسِلُ وَمِنَّا مَنْ لَّا يَغْتَسِلُ))[2]

[1]ابوداؤد مع العون ۴۳۸،۸،ترمذی مع التحفہ ۷۰،۴،احکام الجنائز للالبانی،ص:۵۳ وحسّنہٗ [2] کلاھمافی احکام الجنائز للالبانی،ص:۵۳۔۵۴

" ہم میّت کو غسل دیتے تھے اور ہم میں سے بعض تو غسل کر لیتے اور بعض غسل نہیں کیا کرتے تھے۔"

کفن کا کپڑا:

میّت کو غسل دینے کے بعد کفن دیا جاتا ہے جو کہ واجبات میں سے ہے اور کفن کے کپڑے کا عمدہ ہونا مستحب ہے جیسا کہ صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفْنَهٗ))[1]

"تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو کفن دے تو اُسے چاہیئے کہ اچھا کفن دے۔" واضح رہے کہ عمدہ سے مراد صاف ستھرا ہے قیمتی نہیں کیونکہ قیمتی کپڑے میں کفن دینے سے کیا حاصل ہو گا؟ وہ تو بہر حال گل سڑ ہی جائے گا۔ یہی بات بعض ضعیف روایات میں بھی آئی ہے۔[2]

کفن کے کپڑوں کا بہت قیمتی تو کیا نیا ہونا بھی کوئی ضروری نہیں، دھویا ہوا صاف ستھرا مستعمل کپڑا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ صحاح و سنن کی حدیث ابھی قریب ہی گزری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے کفن میں اپنی (تہبند کے طور پر) مستعمل چادر دی تھی اور مستعمل کپڑے سے کفن دینے کے جواز پر تمام آئمہ و فقہاء کا اجماع ہے۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وفات کے قریب ایک کپڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

((اِغْسِلُوْا ثَوْبِیْ هَذَا وَزِيْدُوْا عَلَيْهِ ثَوْبَيْنِ فَكَفِّنُوْنِیْ فِيْهَا))

[1]مشکوٰۃ ۵۱۸،۱،الفتح الربانی ۱۷۰،۷،احکام الجنائز للالبانی،ص:۵۸،المنتقیٰ مع النیل ۳۵،۴،۲ [2] انظر المشکوٰۃ ۵۱۸،۱

" اسے دھو لینا اور دو کپڑے دوسرے لے لینا اور میرا کفن بنا لینا۔"

صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

" ابا جان! آپ کا یہ کپڑا تو پرانا ہو چکا ہے۔"

تب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَیَّ اَوْلٰی بِالْجَدِيْدِ مِنَ الْمَيِّتِ))

"میّت کی نسبت نئے کپڑوں کا زیادہ مستحق زندہ آدمی ہوتا ہے۔"[1]

رضی اللہ عن ابی بکر وارضاہ

سفید کپڑے کی فضیلت :

کفن کے کپڑوں کا سفید ہونا افضل ہے کیونکہ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِلْبِسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضِ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ))[2]

"اپنے کپڑوں میں سے سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ تمہارے بہترین کپڑے ہیں اور اِن (سفید کپڑوں) ہی میں اپنے مُردوں کو کفن دیا کرو۔"

مرد کے کفن کے کپڑے:

مرد کا کفن تین چادروں پر مشتمل ہونا چاہیئے، ایک چادر بطورِ قمیص، دوسری بطورِ تہبند اور تیسری بطورِ لفافہ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((اَنَّ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم كُفِّنَ فِى ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ بِيْضٍ سُحُوْلِيَّةٍ لَيْسَ فِيْهَا

[1]نیل الاوطار ۲،۴،۳۵،مصنّف عبدالرزاق۳،۴۲۴،مصنّف ابن ابی شیبہ ۳،۲۸۵،نصب الرایۃ ۲،۳۶۲ [2] مشکوٰۃ ۱،۵۱۸ وصححہٗ شیخ ناصرالدین ۷،۱۷۰-۱۷۱،ترمذی مع التحفہ ۴،۷۲

قَمِيْصٌ وَلَا عَمَامَةٌ))[1]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین سفید سحولی (یمنی) کپڑوں میں کفن دیئے گئے اور ان میں قمیص اور پگڑی شامل نہیں تھی۔" اکثر صحابہ و تابعین، عام محدّثین اور امام شافعی و احمد سمیت جمہور اہلِ علم کا تو یہی مسلک ہے البتہ امام مالک اور احناف کے نزدیک کفن میں قمیص بھی ہونی چاہیئے اور امام مالک کے نزدیک عمامہ بھی، اُن کا کہنا ہے کہ مذکورہ حدیث میں اگرچہ صرف تین کپڑوں کا ہی ذکر ہے اور یہ جائز بھی ہے لیکن بعض دیگر روایات میں قمیص کا بھی ذکر ہے اور امام مالک کے نزدیک عمامہ بھی مستحب ہے، لیکن جمہور کے نزدیک وہ روایات متکلّم فیہ ہیں لہٰذا راجح یہی ہے جو بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے۔[2]

عورت کے کفن کے کپڑے:

عورت کا کفن بھی یہی ہے کیونکہ کسی صحیح حدیث سے مرد و زن کے کفن کا فرق ثابت نہیں البتہ مسند احمد کی ایک متکلّم فیہ روایت میں اوڑھنی اور ایک دوسری بڑی چادر کا ذکر بھی ہے جس سے احناف کے نزدیک سینہ بند مراد ہے یوں یہ پانچ کپڑے ہو جاتے ہیں۔[3]

بوقتِ مجبوری کم کپڑے:

مرد کے لیے تین اور عورت کے لیے پانچ کپڑے ہونا عام حالات میں ہے جبکہ مجبوری کے وقت اس سے کم بھی جائز ہے مثلاً:

1۔ میّت کو صرف ایک ہی چادر میں کفن دینا جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب میں حضرت

[1]بخاری مع الفتح ۱۴۰،۳،الفتح الربانی ۱۷۳،۷،ابوداؤد مع العون ۴۲۶،۸-۴۲۵،ترمذی مع التحفہ ۷۴،۴ [2] فتح الباری،تحفۃ الاحوذی،عون المعبود،نیل الاوطار ۴،۲-۳۷-۳۸،الفتح الربانی۷،۱۷۸-۱۷۶ [3] الفتح الربانی۷،۱۷۵-۱۷۶-۱۷۸،احکام الجنائز للالبانی،ص:۶۵

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ مذکور ہے کہ انہیں صرف ایک ہی کپڑے میں کفن دیا گیا۔[1]

مستدرک حاکم میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کفن بھی اسی طرح کا مذکور ہے۔[2] 2

۔ اگر میت کیلئے صرف ایک ہی چادر ہو اور وہ بھی اوپر پوری نہ آرہی ہو تو سر کی طرف سے جتنے جسم پر آئے دے دی جائے اور پاؤں کی طرف سے جو جگہ بچے اس پر کوئی اِذخر (قسم کی گھاس پُھوس) ڈال دی جائے، یہ بھی صحیح بخاری اور دیگر کتب میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہی کی تکفین کے ضمن میں حکمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔[3]

اپنا کفن خود تیار کر کے رکھ لینا:

اپنے کفن کا اپنی زندگی میں ہی تیار کر کے رکھ لینا بھی جائز ہے جیسا کہ بخاری شریف میں ہی ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں مذکور ہے۔[4]

اپنی قبر کھود کر رکھ لینا:

بعض سلفِ صالحین کا جو اپنے لیے قبریں تیار کر لینا مذکور ہوا ہے اس کے بارے میں زین بن منیر (یکے از شارحینِ بخاری) نے لکھا ہے کہ یہ فعل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے ثابت نہیں اور اگر مستحب ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بکثرت واقعات میں ثابت ہوتا۔[5]

غرض مرنے سے پہلے اپنی قبر تیار کر لینا مستحب نہیں اگر ایسا مستحب ہوتا تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہوتا۔[6]

الاختیارات العلمیہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ میں لکھا ہے کہ کسی کیلئے یہ مستحب نہیں ہے کہ وہ اپنی قبر کھود کر رکھ لے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا نہیں کیا اور پھر کوئی

[1]بخاری مع الفتح ۱۴۲،۳ [2] فتح الباری۱۴۲،۳ [3] بخاری مع الفتح۱۴۲،۳ [4] بخاری مع الفتح۱۴۲،۳ [5] فتح الباری۱۴۴،۳ [6] احکام الجنائز وبدعہا للالبانی،ص:۲۵۷-۱۶۱-۱۶۰ نقلاً عن الاختیارات العلمیہ لشیخ الاسلام ابن تیمیہ

یہ تو جانتا ہی نہیں کہ کس کو موت کہاں آئے گی جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾

"اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے موت کہاں آئے گی۔" اور اگر ایسا کرنے سے کسی کا مقصود موت کیلئے تیاری کرنا ہو تو یہ عملِ صالح سے ہوتی ہے نہ کہ قبر کھود لینے سے۔[1]

اگر یہ کام مستحب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے اور جب ان سب نے نہیں کیا تو اس میں خیر واستحباب کہاں سے آئے گا؟ اب ان لوگوں کے عمل کی معلوم نہیں کیا توجیہہ ہے جو اپنے ہاتھوں ہی اپنی قبر کھود لیتے اور اسے بڑا معرکہ باور کرواتے پھرتے ہیں۔

مُحرم کا کفن :

احرام کی حالت میں وفات پانے والے کو صرف احرام کی دو چادروں میں ہی کفن دیا جائے گا جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث ابھی قریب ہی گزری ہے۔

شہید کا کفن:

شہید جن خون آلود کپڑوں میں شہادت پائے اُسے انہی کپڑوں سمیت دفن کیا جانا چاہیئے کیونکہ نسائی و مسند احمد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائِ اُحد رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا تھا:

((زَمِّلُوْهُمْ فِيْ ثِيَابِهِمْ))[2]

"انہیں ان کے کپڑوں میں ہی لپیٹ دو۔"

جبکہ ابو داؤد، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے:

[1]بحوالہ احکام الجنائز للالبانی،ص ۱۶۰-۱۶۱ [2] بحوالہ احکام الجنائز للالبانی،ص:۶۰،نیل الاوطار ۴۰،۴،۲

((اِدْفِنُوْهُمْ بِدِ مَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ))[1]

"انہیں ان کے خون اور کپڑوں سمیت ہی دفن کر دو۔"

ان کپڑوں پر کفن کے صرف ایک اور کپڑے کا اضافہ کرنا مستحب ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزۃ اور مصعب رضی اللہ عنہما کے ساتھ کیا تھا۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے کفن کا واقعہ صحیح بخاری و مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد اور بیہقی میں مذکور ہے جبکہ حضرت حمزۃ رضی اللہ عنہ کے کفن کا واقعہ ابو داؤد و ترمذی، مستدرک حاکم اور بیہقی میں ہے۔[2]

کفن کو خوشبو لگانا:

تکفین کے بعد کفن کو خوشبو لگانا بھی مستحب ہے جیسا کہ مسند احمد، صحیح ابن حبان، بیہقی، مستدرک حاکم اور ابن ابی شیبہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِذَا جَمَّرْتُمُ الْمَيِّتَ فَاجْمِرُوْهُ ثَلَاثاً))[3]

"کہ جب تم میت کو (بخور وغیرہ خوشبو کی) دھونی دو تو تین مرتبہ دو۔"

لیکن احرام کی حالت میں وفات پانے والے کو خوشبو نہیں لگائی جائے گی جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث ابھی ہی گزر چکی ہے۔

کفن کو زمزم میں بھگونے کی رسم:

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ آجکل حجاج کرام اپنے لیے اور اپنے اعزاء واقارب کے لیے کفن کا کپڑا آبِ زمزم میں بھگو کر لاتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین اور سلفِ صالحین سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ آبِ زمزم فی نفسہٖ تو بڑا بابرکت ہے لیکن اگر مرنے والے کے عمل ہی درست نہ ہوں تو پھر آبِ زمزم تو کجا، عبداللہ بن ابیّ بن سلول کو تو نبی

[1]نیل الاوطار ۲،۴،۴۰-۳۹ وتکلم علیہ [2] بحوالہ احکام الجنائز،ص:۵۷-۶۰ [3] احکام الجنائز ایضاً،ص:۶۴،الفتح الربانی۷،۱۸۸صحیح الجامع الصغیر:۴۸۱

صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک قمیص اور نمازِ جنازہ سے بھی فائدہ نہیں ہوا تھا اور پھر اُس جیسوں کی نمازِ جنازہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع ہی کر دیا گیا تھا۔[1]

اِس واقعہ میں بڑی عبرتیں اور لمحاتِ فکر ہیں۔

کفن پر دعائیہ کلمات لکھنے کا رواج:

آج کل کفن پر دعائیہ کلمات لکھنے کا بھی کافی رواج ہے حالانکہ قرآن و سنت، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل، آثارِ صحابہ و تابعین اور آئمہ کرام، کسی سے بھی تو یہ فعل ثابت نہیں اور جو کام خیر القرون میں نہ ہوا ہو وہ باعثِ خیر و برکت ہر گز نہیں ہو سکتا۔[2]

راہداری؟:

کچھ ایسا ہی معاملہ میّت کیلئے "راہداری" کے طور پر قرآن کریم کے ڈھائی سپارے پڑھنے کا بھی ہے کہ جب میّت کو اُٹھا کر باہر لیجانے کا وقت قریب آتا ہے تو عموماً میّت کی قریبی رشتہ دار عورتیں اس راہداری کا بندوبست کر دیتی ہیں، اسکا بھی شریعتِ اسلامیہ کے اصل مصادر سے کوئی ثبوت نہیں ملتا اور میّت کیلئے حقیقی راہداری اسکے اپنے نیک اعمال ہی بن سکتے ہیں۔

جنازے کو کندھا دینا :

جنازہ کو اٹھا کر جنازہ گاہ اور قبرستان کی طرف لیجاتے ہوئے عورتوں کے سوا تمام حاضرین کیلئے جنازے کو باری باری کندھا دینا اور اسکے پیچھے چلنا واجب اور بڑا کارِ ثواب ہے اور میّت کا اپنے مسلمان بھائیوں پر یہ حق بھی ہے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ[سِتٌّ]--اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ))[3]

[1]تفصیل کیلئے سورۂ توبہ،آیت:۸۰ اور ۸۴،ان کی تفسیر اور صحیح بخاری شریف،کتاب الجنائز،باب الکفن فی القمیص۔الخ مع الفتح ۱۳۸٫۳ [2] التراتیب الاداریۃ ۴۴۰٫۱،رد المحتار علی الدرالمختار ۸۴۷.۸۴۸٫۱،احکام الجنائز،ص:۲۴۸ [3] بخاری،مختصرمسلم:۱۴۱۸،الصحیحہ:۱۱۳۲۔صحیح الجامع:۳۱۵۱،۳۱۵۰

"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ[چھ] حقوق ہیں:۔۔۔(جب وہ مر جائے تو) اسکے جنازہ کو کندھا دینا(اور پھر پیچھے چلنا)۔"

بلند آواز سے روتے ہوئے بخور اٹھائے چلنا:

جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے روتے ہوئے اور بخُور وغیرہ اٹھائے ہوئے چلنا منع ہے، چنانچہ ابوداؤد اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
((لَا تُتْبَعُ الْجَنَازَةُ بِصَوْتٍ وَلَانَارٍ))[1]

"جنازے کے پیچھے آواز اور آگ لے کر نہ چلا جائے۔" بلند آواز سے ذکر کرتے ہوئے چلنا: اِسی طرح جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز سے ذکر کرنا بھی ثابت نہیں بلکہ بیہقی میں حضرت قیس بن عبّاد رحمہ اللہ تابعی سے مروی ہے:

((كَانَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم يَكْرَهُوْنَ رَفْعَ الصَّوْتِ عِنْدَالْجَنَائِزِ))

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں کے پاس آواز بلند کرنے سے کراہت کرتے تھے۔"[2]

امام نووی رحمہ اللہ نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ سلف صالحین کا یہ عمل ہی صحیح ہے کہ جنازہ کے ساتھ خاموشی سے چلا جائے اور تلاوتِ قرآن، کلمۂ شہادت یا کوئی بھی ذکر بلند آواز سے نہ کیا جائے۔[3]

[1]ضعفہٗ الالبانی فی الارواء۱۹۳٫۳ واستدل بہٖ مع ذکر الشواھد فی احکام الجنائز،ص:۷۰،الفتح الربانی ۷۱٫۸ [2] بیہقی۷۴٫۴،احکام الجنائز،ص:۷۱ وقال رجالہٗ ثقات [3] للتفصیل الاذکار،ص۱۳۶ بتحقیق الارناؤط طبع دمشق،حاشیہ احکام الجنائز وبدعہا للالبانی،ص:۷۱

سینکڑوں علمائے احناف کے مرتب کردہ فتاویٰ عالمگیری (فتاویٰ ہندیہ) میں بھی شرح امام طحاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جنازے کے ساتھ چلنے والے خاموشی اختیار کریں ان کا اونچی آواز سے قرآن پڑھنا یا ذکر کرنا مکروہ ہے۔[1]

ایسے میں دنیاوی باتیں کرنا تو بالاولیٰ منع ہے اور یہ جو آجکل جنازے کے ساتھ ساتھ بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھا جاتا ہے، اسکی حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ دراصل عیسائیوں کی نقل ہے کیونکہ ان کے یہاں بلند آواز سے انجیل کی تلاوت اور دوسرے اذکار کئے جاتے ہیں۔[2]

ہمارے پاک وہند میں یہ رسم ہندوؤں سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ میت کے ساتھ ساتھ ''رام نام ست ہے'' کا ورد کرتے جاتے ہیں وہی رواج ''کلمۂ شہادت'' کی شکل میں ہمارے یہاں بھی در آیا ہے۔[3]

عورتوں کیلئے حکم:

عورتوں کا جنازے کے ساتھ چلنا صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث کی رو سے منع ہے۔ تاہم یہ نہی تحریمی[4] نہیں بلکہ تنزیہی ہے جیسا کہ مشارالیہ حدیث میں حضرت اُم عطیہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے۔

جنازہ کا حکم و طریقہ:

نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے اور اسکے فرضِ کفایہ ہونے پر امام ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں اجماع ذکر کیا ہے۔[5]

جبکہ بعض مالکی علماء نے اسے سنّت قرار دیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے۔[6]

[1]فتاویٰ ہندیہ ۱٫۱۶۲،الفتح الربانی۸٫۲۳ [2] احکام الجنائز وبدعہا للالبانی،ص:۷۱ [3] جنازے کے مسائل مولانا فضل الرحمن،ص:۵۲ طبع ثانی دارالدعوۃ،السلفیہ لاہور [4] الفتح الربانی ۸٫۲۶-۲۴-۲۱ [5] فتح القدیر ۱٫۴۵۵ [6] الفتح الربانی ۷٫۲۰۱

میدان، جنازہ گاہ یا مسجد میں جنازہ :

نمازِ جنازہ عام طور پر تو جنازہ گاہ میں پڑھی جاتی ہے لیکن یہ کسی کھلے میدان میں بھی پڑھی جاسکتی ہے اور ضرورت کے وقت مسجد میں بھی جنازہ پڑھنا جائز ہے کیونکہ صحیح مسلم شریف، سنن اربعہ، مسند احمد، بیہقی اور ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سُہیل بن بیضاء اور انکے بھائی رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی تھی۔[1]

اِسی حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ مسجد میں بھی پڑھی گئی۔[2]

موطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن سعید بن منصور میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تھی، جبکہ سنن سعید بن منصور اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ بھی مسجد میں پڑھی گئی تھی۔[3]

ان احادیث و آثار کی بناء پر مسجد میں نمازِ جنازہ کا جواز امام شافعی، احمد، ایک روایت کے مطابق امام مالک اور اسحاق بن راہویہ سمیت عام محدّثین اور جمہور اہلِ علم کا مسلک ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام مالک مسجد میں نمازِ جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں، ان کا استدلال بھی ابو داؤد، ابن ماجہ، مسند احمد، بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت سے ہے۔ علاّمہ ابن قیم اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ اگرچہ جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ مسجد سے الگ جنازہ گاہ میں پڑھی جائے، بدایۃُ المجتہد میں علاّمہ ابن رُشد کا رجحان بھی اسی طرف سے ہے اور علاّمہ عبد الرحمن مبارکپوری نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔[4]

[1]صحیح مسلم ۶۶۸،۲ بتحقیق محمد فؤاد عبدالباقی والفتح الربانی ۲۴۸،۷ [2] الفتح الربانی ۲۴۸،۷ [3] الفتح الربانی ۲۴۸،۷ شرح،نیل الاوطار ۶۸،۴،۲ [4] زاد المعاد ۵۰۲،۱۔۵۰۰ بتحقیق الارناؤط،فتح الباری ۱۹۹،۳،بدایۃ المجتہد ۲۹۔۳۰،۲طبع مؤسسہ)

آج کل مسجد نبوی اور مسجد حرام میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے اور اسکا سبب بھی واضح ہے۔[1]

دو یا تین صفیں بنالینا:

ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں مذکور بعض احادیث کی بناء پر مستحب یہ ہے کہ اگر نمازی کم ہوں تو کم از کم تین صفیں بنا لی جائیں چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا اَوْجَبَ(وفَيْ لَفْظٍ:)اِلَّا غُفِرَ لَهٗ))[2]

"اگر کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ میں تین صفیں شریک ہو جائیں تو اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔(اور ایک روایت میں ہے:) اللہ اُسے بخش دیتا ہے۔"
اسی طرح طبرانی کبیر کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

((صَلَّى رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَلٰى جَنَازَةٍ وَمَعَهٗ سَبْعَةُ نَفَرٍ فَجَعَلَ ثَلَاثَةً صَفًّا،وَاثْنَيْنِ صَفًّا))[3]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی نمازِ جنازہ پڑھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات آدمی

[1]حوالہ سابقہ نیز تفصیل کیلئے دیکھیے:نتائج التقلید مولانا محمد اشرف سندھو،ص:۱۳۵ طبع ادارہ دعوۃ الحق بمبئ [2] احکام الجنائز وبدعہا،ص:۹۹۔۱۰۰،نیل الاوطار ۵۴۔۵۵،۴،۲ [3] بحوالہ سابقہ الجنائز

تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں کی ایک صف بنائی، دو کی دوسری اور دو کی تیسری صف بنائی۔" عام آئمہ وفقہاء کا یہی مسلک ہے لیکن امام احمد اور امام بخاری کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر نمازی کم ہوں تو صرف دو صفیں بھی بنائی جاسکتی ہیں۔[1]

جب نمازی کثیر تعداد میں ہوں تو پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ صفیں طاق ہی رہیں بلکہ جتنی بھی بن جائیں جائز ہے اگرچہ طاق کا اپنا ایک مقام ہے لیکن محض اس مقام کے لیے جنازہ سامنے رکھ کر صفیں طاق کرنے اور لوگوں میں شور پیدا کرنے کا فعل مناسب نہیں ہے۔

شرکاء جماعت کی تعداد وصف بندی :

جنازہ میں جتنے زیادہ لوگ شریک ہوں گے اتنا ہی بہتر ہے البتہ بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اگر جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد صرف تین ہو اور ان میں بھی ایک عورت ہو تو ایسا نہیں ہو گا کہ مرد امام کے دائیں پہلو میں کھڑا ہو جائے اور عورت پیچھے جیسا کہ عام نمازوں کی جماعت کا طریقہ ہے بلکہ مقتدی مرد ایک بھی پیچھے ہی کھڑا ہو گا چنانچہ مستدرک حاکم(۱/۳۶۵)و بیہقی(۴/۳۱،۳۰)میں ایک حدیث ہے اور اسکی شاہد حدیث مسند احمد(۳/۲۱۷)میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمیر بن ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ انکے گھر میں یوں پڑھائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے امامت کروا رہے تھے، حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے اکیلے صف میں کھڑے ہو گئے اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے تھیں۔[2]

امام کہاں کھڑا ہو؟

نمازِ جنازہ کیلئے تمام آئمہ وفقہاء کے نزدیک بالاتفاق میت کے کسی بھی حصہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھانا جائز ہے لیکن امام کا کس جگہ کھڑے ہونا افضل ہے اس بارے

[1]بخاری وفتح الباری ۳،۱۸۶،المغنی ۲،۴۱۰ طبع مصر،الفتح الربانی ۷،۲۰۳-۲۰۴ [2] حوالہ جاتِ مذکورہ متن نیز دیکھیے احکام الجنائز ۱۰۰،۹۸

میں آئمہ کی آراء مختلف ہیں: امام احمد، اسحاق بن راہویہ، عام محدّثین، فقہاء شافعیہ ایک روایت میں امام ابو حنیفہ اِسی طرح امام ابو یوسف اور امام طحاوی کے نزدیک اگر میت مرد کی ہو تو نمازِ جنازہ کیلئے امام اسکے سَر کے سامنے اور اگر عورت ہو تو اسکی کمر کے سامنے یعنی وسط میں کھڑا ہو، اِن کا استدلال صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور بیہقی میں مذکور اُس حدیث سے ہے جس میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاس کی حالت میں وفات پانے والی ایک عورت کی نمازِ جنازہ پڑھی اور اسکے وسط میں کھڑے ہوئے۔[1]

جبکہ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور ابن ابی شیبہ میں مرد وعورت کے جنازہ کیلئے کھڑے ہونے کی تفریق بھی مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مرد کے سر اور عورت کے وسط کے سامنے کھڑے ہوا کرتے تھے۔[2]

ایک دوسرے قول کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ میت خواہ مرد کی ہو یا عورت کی امام اسکے سینے کے سامنے کھڑا ہو گا، ان کے نزدیک وسط سے مراد کمر نہیں بلکہ سینہ ہے، اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس سلسلہ میں وسعت ہے کہ جہاں چاہے کھڑا ہو جائے کوئی پابندی نہیں۔

-۱-

عید کے دن غسل کا مستحب ہونا

نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے غسل کرنا مستحب ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں، کہ عید کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔[1]

اس بات پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے، جسے امام ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ انھوں نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ ہٰذَا یَوْمُ عِیْدٍ، جَعَلَہُ اللہُ لِلْمُسْلِمِیْنَ، فَمَنْ جَآءَ اِلَی الْجُمُعَۃِ فَلْیَغْتَسِلْ، وَإِنْ کَانَ طِیْبٌ فَلْیَمَسَّ مِنْہُ، وَعَلَیْکُمْ بِالسِّوَاکِ۔"[2]

"یقینا یہ جمعہ کا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں کے لیے عید بنایا ہے، سو جو شخص جمعہ کے لیے آئے، اسے چاہیے، کہ غسل کرے۔ اور اگر خوشبو میسر ہو، تو اسے استعمال کرے، اور تم مسواک کو لازم کرو۔" جب جمعہ کے دن غسل کرنے، خوشبو استعمال کرنے اور مسواک کرنے کا اس حدیث میں سبب یہ بیان کیا گیا ہے، کہ جمعہ کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کے لیے عید بنایا ہے، تو پھر عید کے دن تو ان تینوں کاموں کا کرنا اور زیادہ ضروری اور پسندیدہ ہو گا۔ علامہ ابن قدامہ نے تحریر کیا ہے: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی علّت یہ

[1]ملاحظہ ہو: المغني ۳/۲۵۶؛ نیز ملاحظہ ہو: الأوسط في السنن والإجماع والاختلاف ۴/۲۵۷؛ وبدائع الصنائع ۱/۲۷۹۔ [2] سنن ابن ماجہ، أبواب إقامۃ الصلاۃ، باب ما جاء في الزینۃ یوم الجمعۃ، رقم الحدیث ۱۰۸۵، ۱/۱۹۷-۱۹۸۔ حافظ منذریؒ نے اس کی[سند کو حسن]اور شیخ البانی نے اس[حدیث کو حسن]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: الترغیب والترہیب ۱/۴۹۸؛ وصحیح سنن ابن ماجہ ۱/۱۸۱)۔

بیان فرمائی، کہ جمعہ عید ہے۔"[1]

علاوہ ازیں امام مالک نے حضرت نافعؒ سے روایت نقل کی ہے، کہ:

"أَنَّ عَبْدَ اللہِ بْنَ عُمَرَ رضی اللہُ عنہ کَانَ یَغْتَسِلُ یَوْمَ الْفِطْرِ قَبْلَ أَنْ یَغْدُوَ إِلَی الْمُصَلّٰی۔" [2]

"بے شک عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے پہلے غسل کیا کرتے تھے۔"

-۲-

بہترین کپڑے پہن کر عید کے لیے جانا

عید کے لیے بہترین لباس پہن کر جانا مستحب ہے۔[3] امام ابن قیم نے بیان کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے موقع پر اپنا سب سے زیادہ خوبصورت لباس پہنتے تھے۔[4]

اس بات کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے، جسے امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ انھوں نے کہا:

[1]المغني ۳/۲۵۷۔ [2] الموطأ، كتاب العيدين، باب العمل في غسل العيدين، والنداء فيهما، والإقامة، رقم الرواية ۱/۱۷۷، ۲۔ نیز ملاحظہ ہو: مصنف عبد الرزاق، كتاب صلاة العيدين، باب الاغتسال في يوم العيد، رقم الرواية ۵۷۵۳، ۳/۳۰۹؛ ومصنف ابن أبي شيبه، كتاب الصلوات، في الغسل يوم العيدين، ۲/۱۸۱۔ امام عبد الرزاق اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''وأنَا أفْعَلُہُ''[ترجمہ: اور میں بھی[غسل]کرتا ہوں]۔(المصنف ۳/۳۰۹) امام نوویؒ نے اس روایت کو[صحیح]قرار دیا ہے(ملاحظہ ہو: المجموع ۵/۱۰) ؛ نیز ملاحظہ ہو: زاد المعاد ۱/۱۲۱۔ [3] ملاحظہ ہو: الأوسط ۴/۲۶۴؛ وبدائع الصنائع ۱/۲۷۹؛ والمغني ۳/۲۵۷۔ [4] زاد المعاد ۱/۱۲۱۔

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم يَلْبَسُ يَوْمَ الْعِيْدِ بُرْدَةً حَمْرَاءَ۔''[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن سرخ دھاریوں والی چادر زیب تن فرماتے تھے۔'' عید کے موقع پر عمدہ لباس پہننے کے لیے اس حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ انھوں نے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ ایک موٹے ریشمی جبہ کو، جو بازار میں فروخت ہو رہا تھا، اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِبْتَعْ ہٰذِہِ، تَجَمَّلْ بِہَا لِلْعِيْدِ وَالْوَفُوْدِ۔''

''یارسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم-! اسے خرید لیجیے، عید اور وفود سے ملاقات کے وقت زینت کے لیے پہنا کیجیے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''إِنَّمَا ہٰذِہِ لِبَاسُ مَنْ لَّا خَلَاقَ لَہٗ۔''[2]

''یہ تو ان لوگوں کا لباس ہے، جن کا [آخرت میں] کچھ حصہ نہیں۔'' امام بخاری نے اس پر حسبِ ذیل عنوان لکھا ہے:

[بَابٌ فِيْ الْعِيْدَيْنِ وَالتَّجَمُّلِ فِيْہِ][3]

[عیدین اور ان کے موقع پر زینت کا اہتمام کرنے کے بارے میں باب]

حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں، کہ حدیث کا یہ عنوان اس بات سے لیا گیا ہے، کہ

[1]مجمع الزوائد، أبواب العيدين، باب اللباس يوم العيد، ۲/۱۹۸۔ حافظ ہیثمی لکھتے ہیں: ''اسے طبرانی نے[الأوسط]میں روایت کیا ہے اور اس کے روایت کرنے والے[ثقہ]ہیں''(المرجع السابق ۲/۱۹۸)؛ نیز ملاحظہ ہو: سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث ۱۲۷۹، ۳/۲۷۴۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العيدين، جزء من رقم الحديث ۹۴۸، ۲/۴۳۹۔ [3] المرجع السابق ۲/۴۳۹۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید اور وفود سے ملاقات کے وقت زینت کا اہتمام کرنے کی تجویز پر کچھ اعتراض نہیں فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس جبہ کی خریداری کے متعلق مشورے پر سرزنش کی (کیونکہ مردوں کے لیے ریشمی جبہ پہننا حرام ہے)۔[1]

علامہ سندھی رقم طراز ہیں، کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تجویز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ عید کے دن زینت کا اہتمام ان کے ہاں ایک معروف دستور تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر اعتراض نہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ یہ طریقہ [اسلام میں بھی] باقی ہے۔[2]

علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام بیہقی نے نافع سے روایت نقل کی ہے:

''أَنَّ ابْنَ عُمَرَ رضی اللهُ عنہ كَانَ يَلْبَسُ فِيْ الْعِيْدَيْنِ أَحْسَنَ ثِيَابِهِ۔''[3]

''بے شک ابن عمر رضی اللہ عنہ عیدین کے موقع پر اپنا سب سے عمدہ لباس زیب تن کرتے تھے۔'' **تنبیہ:** عیدین کے موقع پر بہترین لباس پہننے کے سلسلے میں یہ تنبیہ ضروری ہے، کہ کوئی مسلمان اس غرض سے اپنے وسائل سے تجاوز نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا درست نہیں۔ ہر مسلمان اپنے وسائل کی حدود میں عمدہ لباس پہنے۔

[1]ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۳۹۔ [2] ملاحظہ ہو: حاشية السندي علٰى سنن النسائي ۳/۱۸۱۔ [3] السنن الكبرىٰ، كتاب صلاة العيدين باب الزينة للعيد، رقم الرواية ۶۱۴۳، ۳/۳۹۸۔ حافظ ابن حجر نے اس کی[سند کو صحیح]کہا ہے۔(ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۳۹)۔

-۳-

عیدین میں کھانا

عیدین کے موقع پر کچھ کھانے کے متعلق قدرے تفصیلی گفتگو ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

۱: عید الفطر:

روانگی سے پہلے کھجوریں تناول کرنا: عید الفطر میں مسنون طریقہ یہ ہے، کہ نمازِ عید کے لیے روانہ ہونے سے پہلے طاق تعداد میں کھجوریں کھائی جائیں۔ اس بارے میں احادیث میں سے دو درجِ ذیل ہیں:

ا: امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم لَا يَغْدُوْ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ۔''[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن کھجوریں تناول فرمائے بغیر نہ نکلتے۔'' ۲: امام حاکم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''مَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم يَوْمَ فِطْرٍ حَتّٰى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ سَبْعًا أَوْ أَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ وِتْرًا۔''[1]

[1]صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الأكل يوم الفطر قبل الخروج، رقم الحديث ۹۵۳، ۲/۴۴۶۔ [1] المستدرک علی الصحیحین، کتاب صلاۃ العیدین، ۱/۲۹۴۔ امام حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر[صحیح]قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔(ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۱/۲۹۴؛ والتلخیص۱/۲۹۴)۔ امام ابن حبان نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ البتہ اس میں[أَوْ أَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ وِتْرًا]کے الفاظ نہیں۔(ملاحظہ ہو: الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب العيدين، ذكر ما يستحب للمرء أَنْ يكونَ أكلُه التمرَ يوم العيد وترا لا شفعًا، رقم الحديث ۲۸۱۴، ۷/۵۳)۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی عید الفطر کے دن تین، پانچ، سات یا اس سے کم یا زیادہ تعداد میں کھجوریں تناول کیے بغیر نہیں نکلے، کھجوروں کی تعداد بہر صورت طاق ہوتی۔''

اس کی حکمت:

اس روز صبح سویرے کھجوریں تناول کرنے میں بندے کی طرف سے اپنے مولائے کریم کے حکم کی فوری تعمیل کا اقرار و اظہار ہے۔ بندہ اپنے عمل سے اس بات کا اعلان کرتا ہے: اے میرے مالک! آپ نے روزے رکھنے کا حکم دیا، تو میں نے روزے رکھے۔ اب آپ کا حکم روزے چھوڑنے کا ہے، تو میں صبح سویرے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی خاطر کھجوریں تناول کر رہا ہوں۔[2] اگر کھجوریں میسر نہ ہوں، تو کھانے کی جو چیز میسر ہو، وہی تناول کر لی جائے۔ اگر پانی کے سوا اور کچھ موجود نہ، ہو تو پانی ہی پی لیا جائے۔[3]

ب: عید الاضحی:

نمازِ عید کے بعد قربانی کے گوشت سے کھانا:

عید الاضحی میں سنت طریقہ یہ ہے، کہ نمازِ عید کے بعد اپنی قربانی کے گوشت کے ساتھ روزِ عید کے کھانے کی ابتدا کرے۔ امام ترمذی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

[2]ملاحظہ ہو: المغني ۳/۲۵۹؛ وفتح الباري ۲/۴۴۷۔ [3] ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۲/۴۴۷۔

''كَانَ النَّبِيُّ صلي اللهُ عليه وسلم لَا يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَطْعَمَ، وَلَا يَطْعَمُ يَوْمَ الْأَضْحٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ۔''[1]

''عید الفطر کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھائے بغیر نہ نکلتے اور عید الاضحی کے دن نماز[عید]پڑھنے تک کچھ تناول نہ فرماتے۔'' اور سنن ابن ماجہ کے الفاظ یوں ہیں:

''وَكَانَ لَا يَأْكُلُ يَوْمَ النَّحْرِ حَتّٰى يَرْجِعَ۔''[2]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے دن[نمازِ عید سے]واپس آنے تک کچھ تناول نہ فرماتے۔''

نمازِ عید سے پہلے کھانے کی اجازت:

اگر کوئی شخص نماز عید الاضحی سے پہلے کچھ تناول کرلے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ امام بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ ان کے ماموں ابوبردۃ بن نیار رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا، کہ انھوں نے نمازِ عید سے پہلے ایک بکری ذبح کی اور نماز کے لیے نکلنے سے پہلے کھانا تناول کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''شَاتُكَ شَاةُ لَحْمٍ۔''[3]

[1]جامع الترمذي، أبواب العيدين، باب في الأكل يوم الفطر قبل الخروج، ۱/۳۸۰۔ ۳۸۱۔ شیخ البانی نے اسے[صحیح]کہا ہے۔(ملاحظہ ہو: صحيح سنن الترمذي ۱/۱۶۸)۔ [2] سنن ابن ماجه، أبواب ما جاء في الصيام، باب في الأكل يوم الفطر قبل أن يخرج، جزء من رقم الحديث ۱۷۶۰، ۱/۳۲۲۔ [3] انظر: صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الأكل يوم النحر، رقم الحديث ۹۵۵، ۲/۴۴۷۔ ۴۴۸۔

''تمہاری بکری تو گوشت کی بکری ہے۔''[یعنی یہ تو قربانی کے لیے نہیں، بلکہ گوشت حاصل کرنے کے لیے ذبح کی گئی ہے]۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید سے پہلے ذبح شدہ بکری کے متعلق تو فرمادیا، کہ وہ قربانی کی بکری نہیں، لیکن اس وقت کھانا تناول کرنے پر کچھ اعتراض نہیں فرمایا۔ اگر نمازِ عید سے پیشتر کھانا تناول کرنا گناہ کا سبب ہوتا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر بھی ضرور تنبیہ فرمادیتے۔

عید گاہ میں نمازِ عید ادا کرنا

سنت یہ ہے، کہ عید کی نماز عید گاہ میں ادا کی جائے۔ متعدد احادیث شریفہ سے یہ بات ثابت ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز عید گاہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ انہی میں سے دو درجِ ذیل ہیں: ۱: امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰي إِلَى الْمُصَلّٰى۔''[1]

[1]صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلّٰى بغير منبر، جزء من رقم الحديث ۹۵۶، ۲/۴۴۸۔۴۵۰۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحی کے دن عید گاہ تشریف لے جاتے تھے۔'' حافظ ابن حجر نے کتاب[أخبار المدينة]سے نقل کیا ہے کہ: ''المصلّٰی[عید گاہ]مدینہ میں ایک معروف جگہ ہے۔ اس کے اور مسجد کے دروازے کے درمیان ایک ہزار ہاتھ کی مسافت ہے۔''[1] علامہ عینی حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ''عید گاہ کی طرف[نمازِ عید کے لیے]نکلا جائے گا اور بلا ضرورت مسجد میں نمازِ عید نہ پڑھی جائے گی۔''[2]

۲: امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ:

''كَانَ النَّبِيُّ صلي اللهُ عليه وسلم يَغْدُوْا إِلَى الْمُصَلّٰى، وَالْعَنْزَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ، تُحْمَلُ، وَتُنْصَبُ بِالْمُصَلّٰى بَيْنَ يَدَيْهِ، فَيُصَلِّيْ إِلَيْهَا۔''[3]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف جایا کرتے تھے اور نیزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہوتا۔ نیزہ کو عید گاہ میں لے جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نصب کیا جاتا اور آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے۔'' امام ابن قیم تحریر کرتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز عید گاہ میں ادا فرماتے۔ ایک روایت کے مطابق... بشرطِ ثبوت روایت... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مرتبہ بارش کی بنا پر مسجد میں نمازِ عید پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی سنت اسے عید گاہ میں ادا کرنا تھا۔[4]

امام بغوی فرماتے ہیں: ''سنت یہ ہے، کہ نمازِ عید کے لیے عید گاہ کی طرف نکلا

[1]فتح الباري ۲/۴۴۹۔ [2] عمدة القاري ۶/۲۸۰۔۲۸۱۔ [3] صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب حمل العنزة أو الحربة بين يدي الإمام يوم العيد، رقم الحديث ۹۷۳، ۲/۴۶۳۔ [4] زاد المعاد ۱/۱۲۱ باختصار۔

جائے، تاہم عذر کی صورت میں نماز مسجد میں ادا کی جائے گی۔''[1] عذر کی صورت میں نمازِ عید مسجد میں ادا کرنے کے بارے میں امام ابن حزم تحریر کرتے ہیں:

''وَقَدْ رَوَيْنَا عَنْ عُمَرَ وَعُثْمَانَ رضی اللهُ عنہ أَنَّهُمَا صَلَّيَا الْعِيْدَ بِالنَّاسِ فِيْ الْمَسْجِدِ لِمَطَرٍ وَقَعَ يَوْمَ الْعِيْدِ۔''[2]

''ہم نے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، کہ انھوں نے عید کے دن بارش ہونے کی بنا پر لوگوں کو مسجد میں نماز عید پڑھائی۔''

-۵-

بچوں کو عید گاہ لے جانا

عیدین کے موقع پر بچوں کو عید گاہ لے جانا سنت سے ثابت ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم يَوْمَ فِطْرٍ أَوْ أَضْحٰى، فَصَلّٰى، ثُمَّ خَطَبَ، ثُمَّ أَتَى النِّسَاءَ، فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ، وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ۔''[1]

''میں عید الفطر یا عید الاضحی کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عید گاہ کی طرف) نکلا، آنحضرت نے نماز پڑھائی، پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر عورتوں کے پاس تشریف لے گئے، تو انھیں وعظ و نصیحت فرمائی اور صدقہ کرنے کا حکم دیا۔'' ایک دوسری روایت سے ثابت ہے، کہ اس وقت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بچے تھے۔[2]

امام بخاری نے اس حدیث پر حسب ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

[بَابُ خُرُوْجِ الصِّبْيَانِ إِلَى الْمُصَلّٰى][3]

[بچوں کے عید گاہ کی طرف جانے کے متعلق باب]

حافظ ابن حجر اس عنوان کی شرح میں لکھتے ہیں:

اگرچہ وہ بچے [اپنی کم سنی کی بجا پر] نماز نہ پڑھیں۔ زین بن منیر نے کہا:

[1]صحيح البخاري، كتاب العيدين، رقم الحديث ۹۷۵، ۲/۴۶۵۔ [2] ملاحظہ ہو: المرجع السابق، باب العلَمَ الذي بالمصلّٰى، رقم الحديث ۹۷۷، ۲/۴۶۵۔ [3] المرجع السابق ۲/۴۶۴۔

مؤلف نے [نمازِ عید کے لیے جانا] کی بجائے [عید گاہ کی طرف جانا] کے عنوان کو ترجیح دی ہے، تاکہ عید گاہ جانے میں سب بچے شریک ہوں، خواہ وہ نماز ادا کرتے ہوں یا [اپنی صغر سنی کی بنا پر] نماز ادا نہ کرتے ہوں۔[1] تنبیہ: بچوں کے سرپرست حضرات اس بات کا خیال رکھیں، کہ بچے نظم وضبط کو خراب نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو، کہ ان کے شور وغل اور کھیل کود کے سبب لوگوں کی نماز میں خلل پیدا ہو۔[2]

-٦-

تکبیرات پکارتے ہوئے عید گاہ جانا

مَردوں کو عید گاہ کی طرف تکبیرات پکارتے جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ}[3]

[ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں۔ وہ چاہتے ہیں، کہ تم [رمضان کے روزوں کی] گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر ان کی تکبیر کہو [بڑائیاں بیان کرو] اور ان کا شکر کرو]۔

حافظ ابن کثیر تحریر کرتے ہیں، کہ علماء کی ایک کثیر تعداد نے اس آیت سے عید الفطر میں تکبیرات کہنے کی مشروعیت کا استنباط کیا ہے۔[4]

[1]ملاحظہ ہو: فتح الباري ٢/٤٦٤۔ نیز دیکھئے: عمدة القاري ٦/٢٩٧۔ [2] ملاحظہ ہو: فتح الباري ٢/٤٦٦۔ [3] سورة البقرة / جزء من الآية ١٨٥۔ [4] ملاحظہ ہو: تفسير ابن كثير ١/٢٣٢-٢٣٣؛ نیز ملاحظہ ہو: تفسير القرطبي ٢/٣٠٦؛ وزاد المسير ١/١٨٨۔

علاوہ ازیں امام ابن ابی شیبہ نے حضرت زہری سے روایت نقل کی ہے، کہ:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم كَانَ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ، فَيُكَبِّرُ، حَتّٰى يَأْتِيَ الْمُصَلّٰى، وَحَتّٰى يَقْضِيَ الصَّلَاةَ، فَإِذَا قَضَى الصَّلَاةَ، قَطَعَ التَّكْبِيْرَ۔" [1]

"یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن تکبیریں کہتے ہوئے عید گاہ کی طرف روانہ ہوتے، نماز ادا کرنے تک تکبیروں کا سلسلہ جاری رکھتے، جب نماز ادا کرلیتے، تو تکبیریں کہنا ترک کردیتے۔" مزید برآں امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے نافع سے روایت نقل کی ہے کہ:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضى اللهُ عنه أَنَّهٗ كَانَ يَغْدُوْ يَوْمَ الْعِيْدِ وَيُكَبِّرُ، وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ، حَتّٰى يَبْلُغَ الْإِمَامُ۔"[2]

"ابن عمر رضی اللہ عنہ روزِ عید بلند آواز سے تکبیریں کہتے ہوئے روانہ ہوتے۔ اور یہ سلسلہ امام کے آنے تک جاری رکھتے۔"

شیخ البانی تحریر کرتے ہیں:

"یہ حدیث عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے جہری آواز سے تکبیریں کہنے کی مشروعیّت پر دلالت کرتی ہے اور مسلمانوں کا اس پر ہمیشہ سے عمل رہا ہے، اگرچہ اب بہت سے لوگوں نے دینی جذبہ کی کمزوری اور اظہارِ سنت میں

[1]المصنف، كتاب الصلوات، في التكبير إذا خرج إلى العيد، ۱۶۴/۲۔ شیخ البانی نے لکھا ہے، کہ: اگر یہ حدیث[مرسل]نہ ہوتی، تو اس کی سند[صحیح]ہے، البتہ امام بیہقی نے جو[موصول]حدیث روایت کی ہے، اس کی وجہ سے یہ حدیث[قوی]ہوگئی ہے۔(ملاحظہ ہو: سلسلۃ الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث ۱۷۱، ۱/۲/۱۱۹)۔ [2] المصنف، كتاب الصلوات، في التكبير إذا خرج إلى العيد، ۲/۱۶۴؛ والسنن الكبرىٰ، كتاب صلاة العيدين، باب التكبير ليلة الفطر ويوم الفطر، وإذا غدا إلىٰ صلاة العيد، ۳/۳۹۴۔ الفاظِ حدیث المصنف کے ہیں۔

جھجک کی بنا پر اس بارے میں اس قدر سستی شروع کر دی ہے، کہ یہ سنت قصہ پارینہ بنتی نظر آرہی ہے۔"[1]

تنبیہ:

یہاں اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، کہ لوگوں کا ایک آواز میں تکبیریں کہنا ثابت نہیں اور ہم سب کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے، کہ بہترین طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے: ''وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صلي اللهُ عليه وسلم۔''[2]

-۷-

تکبیرات کہنے کے اوقاتِ آغاز و اختتام

عیدین میں تکبیرات کہنے کے آغاز اور اختتام کے متعلق تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

۱: عید الفطر میں:

امام طبری نے ابن زید سے روایت نقل کی ہے، کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

[1]ملاحظہ ہو: سلسلۃ الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث ۱۷۱، ۱/۲/۱۲۱۔ [2] ملاحظہ ہو: سلسلۃ الأحاديث الصحيحة ۱/۲/۱۲۱۔

''حَقٌّ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ إِذَا نَظَرُوْا إِلٰى بِلَالِ شَوَّالٍ أَنْ يُكَبِّرُوْا اللهَ، حَتّٰى يَفْرُغُوْا مِنْ عِيْدِهِمْ، لِأَنَّ اللهَ تَعَالٰى ذِكْرُهُ، يَقُوْلُ: {وَلِتُكْمِلُوْا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوْا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ[1]}۔''[2]

"شوال کا چاند دیکھنے پر مسلمانوں پر لازم ہے، کہ وہ تکبیر کہیں اور تکبیر کہنے کا یہ سلسلہ عید سے فارغ ہونے تک جاری رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:(جس کا ترجمہ یہ ہے: "اور تا کہ تم [رمضان کے روزوں کی] گنتی پوری کر لو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر ان کی تکبیر کہو]"

علامہ ابن قدامہ نے تحریر کیا ہے:

"مذکورہ آیت کریمہ کی بنا پر دونوں عید کی راتوں میں [3] سب لوگ، خواہ وہ مسافر ہوں یا مقیم، اپنی مسجدوں، گھروں اور راستوں میں بآواز بلند تکبیر کہیں۔"[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں: "عید الفطر میں تکبیر کا آغاز چاند دیکھنے سے اور اختتام عید سے فارغ ہونے پر ہے۔ اور عید سے فارغ ہونے سے... صحیح قول کے مطابق... مراد یہ ہے، کہ امام خطبہ سے فارغ ہو جائے۔"[5]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ، عید الفطر میں تکبیر شوال کا چاند دیکھنے سے لے کر امام کے خطبہ عید سے فارغ ہونے تک کہی جائے۔

[1]سورة البقرة / جزء من الآية ١٨٥۔ [2] تفسير الطبري، رقم الرواية ٢٩٠٣، ٣/٤٧٩؛ نيز ملاحظہ ہو: زاد المسير ١/١٨٨، وتفسير البغوي ١/١٥٣۔ [3] عید کی رات سے مراد روز عید سے پہلے والی رات ہے۔ [4] المغني ٣/٢٥٥۔ [5] مجموع الفتاوىٰ ٢٤/٢٢١۔

ب: عید الاضحی میں تکبیرات کہنے کا وقت آغاز و اختتام:

اس بارے میں حافظ ابن حجر رقم طراز ہیں: "اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔ حضرات صحابہ کے اقوال میں سے سب سے زیادہ صحیح قول علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے، کہ تکبیر یوم عرفہ کی صبح سے منیٰ کے آخری دن تک ہے۔"[1]

بعض علماء کی رائے میں یہ تکبیرات صرف فرض نمازوں کے بعد ہیں، لیکن امیر المومنین عمر فاروق اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے، کہ وہ دیگر اوقات میں بھی تکبیرات پکارا کرتے تھے۔ امام بخاری نے تحریر کیا ہے:

[بَابُ التَّكْبِيْرِ أَيَّامَ مِنٰى وَإِذَا غَدَا إِلٰى عَرَفَةَ، وَكَانَ عُمَرُ رضى اللهُ عنہ يُكَبِّرُ فِيْ قُبَّتِهِ بِمِنٰى، فَيَسْمَعُهُ أَهْلُ الْمَسْجِدِ، فَيُكَبِّرُوْنَ، وَيُكَبِّرُ أَهْلُ الْأَسْوَاقِ، حَتّٰى تَرْتَجَّ مِنٰى تَكْبِيْرًا۔ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رضى اللهُ عنہ يُكَبِّرُ بِمِنٰى تِلْكَ الْأَيَّامِ، وَخَلْفَ الصَّلَوَاتِ، وَعَلٰى فِرَاشِهٖ، وَفِيْ فُسْطَاطِهٖ، وَمَمْشَاهُ تِلْكَ الْأَيَّامِ جَمِيْعًا۔''[2]

"منیٰ کے دنوں میں اور عرفات کی طرف روانگی کے وقت تکبیر کہنے کے متعلق باب، منیٰ میں عمر رضی اللہ عنہ اپنے خیمے میں تکبیر کہتے، تو مسجد والے ان کی تکبیر کو سن کر تکبیر

[1]فتح الباري ٢/٤٦٢؛ نيز ملاحظہ ہو: عمدة القاري ٦/٢٩٣۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العيدين، ٢/٤٦١۔

کہتے۔ اور [مسجد والوں کی تکبیر سن کر] بازاروں والے تکبیر کہتے، یہاں تک کہ منیٰ تکبیر کی آواز سے گونج اٹھتا تھا اور ابن عمر رضی اللہ عنہ ان سب دنوں میں نمازوں کے بعد، اپنے بستر پر، اپنے خیمے میں، اپنی مجلس اور اپنی راہ میں تکبیر کہا کرتے تھے۔"

-۸-

تکبیرات کے الفاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکبیرات کے الفاظ کے متعلق میرے محدود علم میں کوئی حدیث نہیں، البتہ حضرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے الفاظِ تکبیر کا ذکر کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ اس بارے میں ذیل میں تین روایات ملاحظہ فرمائیے:

ا: حافظ ابن حجر نے تحریر کیا ہے: الفاظِ تکبیر کے بارے میں سب سے صحیح روایت وہ ہے، جسے امام عبد الرزاق نے سلمان رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، کہ انھوں نے کہا: "كَبِّرُوْا اللهَ: اَللهُ اَكْبَرُ، اَللهُ اَكْبَرُ، اَللهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا۔" [1] اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو: "اَللهُ اَكْبَرُ، اَللهُ اَكْبَرُ، اَللهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا۔" [2]

ب: امام ابن شیبہ نے ابو الاحوص کے حوالے سے حضرت عبد اللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ:

"أَنَّهُ كَانَ يُكَبِّرُ أَيَّامَ التَّشْرِيْقِ:

"اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ اَكْبَرُ، وَلِلهِ الْحَمْدُ۔" [3

]بلاشبہ وہ ایامِ تشریق میں بایں الفاظ تکبیر کہتے تھے:

[1]فتح الباري ۲/۴۶۲۔ [2] [ترجمہ: اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، بہت بڑے۔]
[3] المصنف، كتاب الصلوات، كيف يكبر يوم عرفة؟ ۲/۱۶۷۔ شیخ البانی نے اس کی سند کو[صحیح]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: إرواء الغليل ۳/۱۲۵)۔

"اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ، وَلِلهِ الْحَمْدُ۔" [1]

ج: امام ابن ابی شیبہ نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا:

"أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ: "اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللهُ أَكْبَرُ وَأَجَلُّ، اَللهُ أَكْبَرُ، وَلِلهِ الْحَمْدُ۔" [2]

وہ [تکبیرات میں] کہا کرتے تھے: "اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، اَللهُ أَكْبَرُ وَأَجَلُّ، اَللهُ أَكْبَرُ، وَلِلهِ الْحَمْدُ۔" [3]

الفاظِ تکبیر کے متعلق-واللہ تعالیٰ اَعلم بالصواب-یہی بات معلوم ہوتی ہے، کہ مخصوص الفاظ کی پابندی نہیں، البتہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک سے ثابت شدہ الفاظ کے ساتھ تکبیرات کہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔

-۹-

تکبیرات کون کہے؟

] [1]ترجمہ: اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں]۔ [2] المصنف، كتاب الصلوات، كيف يكبر يوم عرفة؟ ۲/۱۶۸۔ [3] [ترجمہ: اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، بہت بڑے، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں، بہت بڑے، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے اور[سب سے]زیادہ بزرگی والے ہیں، اللہ تعالیٰ[سب سے]بڑے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں۔[

توفیقِ الٰہی سے اس سوال کا جواب درجِ ذیل دو نکات کے ضمن میں پیش کیا جارہا ہے:

ا: عیدین کے موقع پر سب اہلِ اسلام تکبیرات کہیں۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی تکبیرات کہیں۔ امام بخاری نے نقل کیا ہے:

''وَكَانَتْ مَيْمُوْنَةُ رضى اللهُ عنها تُكَبِّرُ يَوْمَ النَّحْرِ، وَكُنَّ النِّسَائُ يُكَبِّرْنَ خَلْفَ أَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ رضى اللهُ عنه وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ لَيَالِيَ التَشْرِيْقِ مَعَ الرِّجَالِ فِيْ الْمَسْجِدِ۔''[1]

"قربانی کے دن میمونہ رضی اللہ عنہا تکبیر کہتی اور تشریق کی راتوں میں[2]عورتیں ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ[3] اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے پیچھے مسجد میں مَردوں کے ساتھ تکبیر کہتی تھیں۔"

ب: بیماری کے دنوں والی خواتین بھی تکبیرات کہتی۔ امام بخاری نے حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے کہا: '

'كُنَّا نُؤْمَرُ أَنْ نَخْرُجَ يَوْمَ الْعِيْدِ، حَتّٰى نُخْرِجَ الْبِكْرَ مِنْ خِدْرِهَا، حَتّٰى نُخْرِجَ الْحُيَّضَ فَيَكُنَّ خَلْفَ النَّاسِ، فَيُكَبِّرْنَ بِتَكْبِيْرِهِمْ، وَيَدْعُوْنَ بِدُعَائِهِمْ، يَرْجُوْنَ بَرَكَةَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَطُهْرَتَهٗ۔''[4]

[1]صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منٰى، وإذا غدا إلٰى عرفة، ۲/۴۶۱۔ [2] (تشریق کی راتیں): گیارہ، بارہ، تیرہ ذوالحجہ کی راتیں۔ [3] (ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ): یہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اور عبد الملک بن مروان کے زمانے میں مدینہ طیبہ کے گورنر تھے۔(ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۶۲)۔ [4] صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب التكبير أيام منٰى، وإذا غدا إلٰى عرفة، رقم الحديث ۹۷۱، ۲/۴۶۱۔

"ہمیں روزِ عید[عید گاہ کی طرف]نکلنے کا حکم دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم دوشیزاؤں کو ان کے پردوں سے نکالیں اور حیض والی عورتوں کو بھی نکالیں، البتہ وہ لوگوں کے پیچھے رہیں، اور ان کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہیں، اور ان کی دعا کے ساتھ دعا کریں۔ وہ اس دن کی برکت اور گناہوں کی معافی کی امید رکھتیں۔"

تنبیہ:

عورتیں ایسی آواز سے تکبیر نہ کہیں، کہ ان کی آواز مردوں تک پہنچے۔

-۱۰-

نمازِ عیدین کا حکم

عیدین کی نماز ادا کرنا اہلِ اسلام پر واجب ہے۔ اس بارے میں چند ایک دلائل درج ذیل ہیں:

۱: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: {فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ-}[1]

[ترجمہ: لہٰذا آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے]۔

علامہ قرطبی نے حضراتِ ائمہ قتادہ، عطاء، عکرمہ سے نقل کیا ہے، کہ {فَصَلِّ لِرَبِّکَ} سے مراد قربانی کے دن نمازِ عید ہے۔[2]

[1]سورة الكوثر / الآية ۲۔ [2] ملاحظہ ہو: تفسير القرطبي ۲۰/۲۱۸۔

حافظ ابن جوزی نے {فَصَلِّ لِرَبِّکَ} کی تفسیر میں تحریر کیا ہے، کہ اس نماز کے بارے میں تین اقوال ہیں اور ان میں سے پہلا قول یہ ہے، کہ اس سے مراد نمازِ عید ہے۔[1]

مذکورہ بالا حضراتِ ائمہ کی تفسیر کے مطابق اللہ عزوجل نے نمازِ عید پڑھنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کسی بات کا حکم دینا اس بات کی فرضیت اور وجوب پر دلالت کرتا ہے۔[2]

۲: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نمازِ عید ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ امام ابوداؤد نے حضرت عمیر بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے اپنے چچاؤں سے، جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھے، روایت بیان کی ہے، کہ:

"أَنَّ رَكْبًا جَاؤُا إِلَى النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم يَشْهَدُوْنَ أَنَّهُمْ رَأَوُا الْهِلَالَ بِالْأَمْسِ، فَأَمَرَهُمْ أَنْ يُفْطِرُوْا، وَإِذَا أَصْبَحُوْا يَغْدُوْا إِلَى مُصَلَّاهُمْ۔"[3]

"سواروں کی ایک جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور اس بات کی شہادت دی کہ انھوں نے کل شام [شوال کا] چاند دیکھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں (یعنی حضراتِ صحابہ) کو حکم دے دیا، کہ روزہ افطار کر دو اور کل صبح [نمازِ عید کے لیے] عید گاہ آجاؤ۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ صحابہ کو نمازِ عید کے

[1]ملاحظہ ہو: زاد المسیر ۹/۲۴۹۔ [2] ملاحظہ ہو: بدائع الصنائع ۱/۲۷۵۔ [3] سنن أبي داود، باب تفريع أبواب الجمعة، باب إذ لم يخرج الإمام للعيد من يومه يخرج من الغد، رقم الحديث ۱۱۵۴، ۴/۱۳۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی سند کو[صحیح]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: بلوغ المرام ص ۹۷)۔

لیے نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور کسی کام کے کرنے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینا، اس عمل کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ ۳: پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو بھی عید گاہ جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام مسلم نے حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے کہا:

''أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم أَنْ نُّخْرِجَهُنَّ فِيْ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰى، الْعَوَاتِقَ، وَالْحُيَّضَ، وَذَوَاتِ الْخُدُورِ، فَأَمَّا الْحُيَّضُ فَيَعْتَزِلْنَ الصَّلٰوةَ، وَيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ، وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ۔''

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا، کہ ہم عورتوں کو عید الفطر اور عید الاضحی میں [عید گاہ] لے جائیں، جوان لڑکیوں، حیض والی عورتوں اور پردہ نشین خواتین کو بھی۔ البتہ حیض والی عورتیں نماز سے الگ رہیں اور وہ خیر اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوں۔'' [حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں] میں نے عرض کیا: ''يَا رَسُولَ اللهِ! إِحْدَانَا لَا يَكُونُ لَهَا جِلْبَابٌ''۔

[یارسول اللہ! ہم میں سے کسی کے پاس جلباب نہیں ہوتی]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لِتُلْبِسْهَا أُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا''۔[1]

''اس کی بہن اسے اپنی جلباب اوڑھادے۔''

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسلمان عورتوں کے عید گاہ جانے کی اس قدر

[1]حوالہ حدیث کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا ص۲۴۔

شدید تاکید ہے، تو مسلمان مردوں کا، نمازِ عید ادا کرنے کی غرض سے عید گاہ جانا، کس قدر ضروری ہو گا؟ ۴: عید اور جمعہ ایک دن ہونے کی صورت میں نمازِ عید ادا کی جاتی ہے اور عام لوگوں پر جمعہ کی فرضیّت باقی نہیں رہتی۔ امام ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو عیدیں [عید اور جمعہ] اکھٹی ہو گئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نمازِ [عید] پڑھائی اور فرمایا:

''مَنْ شَاءَ أَنْ يَأْتِيَ الْجُمُعَةَ فَلْيَأْتِهَا، وَمَنْ شَاءَ أَنْ يَتَخَلَّفَ، فَلْيَتَخَلَّفْ۔''[1]

"جو جمعہ کے لیے آنا چاہے آجائے، اور جو نہ آنا چاہے، نہ آئے۔" جیسا کہ معلوم ہے، کہ نمازِ جمعہ فرض ہے اور اگر نمازِ عید فرض نہ ہوتی، تو اس کی وجہ سے نمازِ جمعہ کی فرضیّت کس طرح ساقط ہو سکتی تھی؟ ۵: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عیدین ہمیشہ ادا فرمائی اور کبھی بھی اسے ترک نہ کیا۔ علامہ ابن قدامہ نماز عیدین کے وجوب کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''وَمُدَوَامَةُ النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم عَلٰى فِعْلِهَا۔''[2]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے ہمیشہ ادا کرنا۔" و: نمازِ عیدین اسلام کے ظاہری شعائر میں سے ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں، کہ اسی وجہ سے ہم نے اس قول کو ترجیح دی ہے، کہ یہ سب پر واجب ہے۔[3]

[1]سنن ابن ماجہ، أبواب إقامة الصلاة، باب ما جاء إذا اجتمع العيدان في يوم، رقم الحديث ۱۳۰۶، ۱/۲۳۸۔ شیخ البانی نے اسے[صحیح]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: صحيح سنن ابن ماجہ، ۱/۲۲۰)۔ [2] المغني ۳/۲۵۴۔ [3] ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوىٰ ۲۳/۱۶۱۔

-۱۲-

نمازِ عیدین کا وقت

نمازِ عیدین کا وقت طلوعِ آفتاب کے بعد نفلی نماز ادا کرنے کا وقت ہے۔ امام ابو داؤد نے یزید بن خمیر رحبی سے روایت نقل کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ عید الفطر یا عید الاضحی میں لوگوں کے ساتھ (عید گاہ کی طرف) نکلے۔ انھوں نے امام کے دیر کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا:

''إِنَّا كُنَّا قَدْ فَرَغْنَا سَاعَتَنَا هٰذِهٖ''، وَذٰلِكَ حِيْنَ التَّسْبِيْحِ۔[1] ''[2]

''ہم تو اس وقت فارغ بھی ہو چکے تھے''، اور وہ وقت نمازِ چاشت کا تھا۔'' علامہ محمد شمس الحق عظیم آبادی تحریر کرتے ہیں: ''عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی حدیث نمازِ عید جلد ادا کرنے کی مشروعیّت ،اور زیادہ تاخیر کرنے کی کراہت پر دلالت کرتی ہے۔''[3]

نمازِ عید جلدی ادا کرنے کی مشروعیت پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے، جسے امام بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا، کہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا:

''إِنَّ أَوَّلَ مَا نَبْدَأُ بِهٖ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا أَنْ نُصَلِّيَ، ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَقَدْ أَصَابَ سُنَّتَنَا۔''[4]

) [1]وذٰلک حين التسبيح): امام سیوطی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''وہ نمازِ چاشت ادا کرنے کا وقت تھا۔''(ملاحظہ ہو: عون المعبود ۳/۳۴۲)۔ [2] سنن أبي داود، تفريع أبواب الجمعة، باب وقت الخروج إلى العيد، رقم الحديث ۱۱۳۲، ۳/۳۴۲۔ امام نووی نے اس کی[سند کو مسلم کی شرط پر صحیح]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: عون المعبود ۳/۳۴۳)۔ [3] عون المعبود ۳/۳۴۳۔ [4] صحيح البخاري، كتاب العيدين، جزء من رقم الحديث ۹۶۸، ۲/۴۵۶۔

''یقیناپہلا کام جس کے ساتھ ہم اپنے اس دن کا آغاز کرتے ہیں، وہ یہ ہے، کہ ہم نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر واپس جاکر قربانی کرتے ہیں۔ جس شخص نے اسی طرح کیا، اس نے ہماری سنت کو پالیا۔''

امام بخاری نے اس حدیث پر حسبِ ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

[بَابُ التَّبْكِيْرِ إِلَى الْعِيْدِ][1] [

عید کے لیے جلدی کرنے کے متعلق باب] حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں:'' یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ عید کے دن نمازِ عید اور اس کے لیے روانگی کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول ہونا مناسب نہیں۔ اور اس سے یہ بات لازم آتی ہے، کہ نمازِ عید سے پہلے دوسرا کوئی اور کام نہ کیا جائے اور اس کا تقاضا یہ ہے، کہ نمازِ عید جلدی ادا کی جائے۔''[2]

تنبیہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کی نماز، البتہ قدرے تاخیر سے ادا کرتے تھے۔ امام ابن قیم نے تحریر کیا ہے:

''وَكَانَ يُؤَخِّرُ صَلَاةَ عِيْدِ الْفِطْرِ، وَيُعَجِّلُ الْأَضْحٰى۔''[3]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید الفطر[قدرے]تاخیر سے ادا کرتے تھے اور

[1]المرجع السابق ۲/۴۵۶۔ [2] فتح الباري ۲/۴۵۷؛ نیز ملاحظہ ہو: عمدة القاري ۶/۲۸۸۔ [3] زاد المعاد ۱/۱۲۱۔

نمازِ عید الاضحی جلدی ادا کرتے تھے۔"

-۱۲-

نمازِ عیدین سے پہلے اذان واقامت اور کوئی ندا نہیں

مولائے کریم کی توفیق سے اس بارے میں گفتگو درجِ ذیل تین نکات کے ضمن میں کی جارہی ہے: ا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عیدین بلا اذان واقامت پڑھائی۔

امام مسلم نے حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے فرمایا:

"صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم اَلْعِيْدَيْنِ غَيْرَ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَةٍ۔"[1]

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیدین کی نماز ایک دو مرتبہ نہیں، متعدد مرتبہ، بلا اذان واقامت پڑھی۔" ب: جب حضرت ابن زبیر کی بیعتِ خلافت ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے انھیں اسی سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ امام مسلم نے عطاء سے روایت نقل کی ہے، کہ جب ابن الزبیر کی بیعت ہوئی، تو ابن عباس رضی اللہ عنہم نے انھیں یہ پیغام بھیجا:

"أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ يُؤَذَّنُ لِلصَّلَاةِ يَوْمَ الْفِطْرِ، فَلَا تُؤَذِّنْ لَهَا۔"[2]

"عید الفطر کی نماز کے لیے اذان نہیں دی جاتی تھی، سو تم بھی اس کے لیے

[1]صحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، رقم الحديث ۷-(۸۸۷)، ۲/۶۰۴۔ [2] صحيح مسلم، رقم جزء من الحديث ۶-(۸۸۶)، ۲/۶۰۴۔

اذان نہ دینا۔"

امام مالک اس بارے میں فرماتے ہیں:

"أَنَّهُ سَمِعَ غَيْرَ وَاحِدٍ مِنْ عُلَمَائِهِمْ يَقُوْلُ: "لَمْ يَكُنْ فِيْ عِيْدِالْفِطْرِ، وَلَا فِيْ الْأَضْحٰى نِدَاءٌ، وَلَا إِقَامَةٌ مُنْذُ زَمَانِ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم إِلَى الْيَوْمِ۔"[1]

"انھوں نے اپنے کئی ایک علماء سے سنا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک عید الفطر اور عید الاضحی میں نہ اذان ہے اور نہ اقامت۔" اس کے بعد امام مالک رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

"وَتِلْکَ السُّنَّۃُ الَّتِيْ لَا اِخْتِلَافَ فِيْہَا عِنْدَنَا۔"[2]

"اور یہ ایسی سنت ہے، کہ اس کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں۔"

ج: اذان و اقامت کے علاوہ نمازِ عیدین کے لیے کوئی اور ندا یا بلاوہ دینا بھی سنت سے ثابت نہیں۔ امام مسلم نے عطاء سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے کہا، کہ: "مجھے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی، کہ:

"أَنْ لَّا أَذَانَ لِلصَّلَاۃِ يَوْمَ الْفِطْرِ حِينَ يَخْرُجُ الْإِمَامُ، وَلَا بَعْدَ مَا يَخْرُجُ، وَلَا إِقَامَۃَ، وَلَا نِدَآءَ، وَلَا شَيْئَ، لَا نِدَآءَ يَوْمَئِذٍ، وَلَا إِقَامَۃَ۔"[3]

[1]المؤطا، کتاب العیدین، باب العمل في غسل العیدین والنداء فیہما والإقامۃ، ۱/۱۷۷۔ [2] المرجع السابق ۱/۱۷۷۔ [3] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ العیدین، رقم الحدیث ۵۔(۸۸۶)، ۲/۶۰۴۔

"عید الفطر کے دن نماز کے لیے اذان نہیں، نہ امام کے نکلنے کے وقت، اور نہ اس کے نکلنے کے بعد، اور نہ تو اقامت ہے اور نہ ندا، اور نہ کچھ اور۔ اس دن ندا نہیں ہے اور نہ اقامت۔"

د: بعض حضرات کی رائے میں نمازِ عیدین کے لیے

[اَلصَّلَاۃُ جَامِعَۃٌ]

[نماز کھڑی ہو رہی ہے] کے الفاظ کے ساتھ آواز لگائی جائے۔ امام ابن قدامہ نے اس بارے میں بڑا عمدہ، موثر اور مختصر تبصرہ بایں الفاظ کیا ہے:
"وَسُنَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلي اللّٰہُ عليه وسلم أَحَقُّ أَنْ تُتَبَّعُ۔"[1]

"اتباع کا سب سے زیادہ حق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔" امام ابن قیم اس بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"وَکَانَ صلي اللّٰہُ عليه وسلم إِذَا انْتَہٰی إِلَی الْمُصَلّٰی أَخَذَ فِيْ الصَّلَاۃِ مِنْ غَيْرِ أَذَانٍ، وَلَا إِقَامَۃٍ، وَلَا قَوْلٍ: "اَلصَّلَاۃُ جَامِعَۃٌ"، وَالسُّنَّۃُ أَنْ لَا يُفْعَلَ شَيْئٌ مِنْ ذٰلِکَ۔"[2]

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عید گاہ تشریف لے آتے، تو اذان، اقامت اور [اَلصَّلَاۃُ جَامِعَۃٌ] کے الفاظ کہے بغیر نماز شروع کر دیتے اور سنت یہی ہے، کہ ایسی کوئی بات نہ کی جائے۔" سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز اس بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"إِنَّ النِّدَاءَ لِلْعِيْدِ بِدْعَۃٌ بِأَيِّ لَفْظٍ کَانَ۔ وَاللّٰہُ أَعْلَمُ۔"[3]

[1]المغني ٣/٢٦٨۔ [2] زاد المعاد ١/٤٤٢۔ [3] ملاحظہ ہو: هامش فتح الباري للشيخ ابن باز ٢/٤٥٢۔

''عید کے لیے کسی بھی لفظ کے ساتھ نداء کرنا یقیناً بدعت ہے۔ واللہ أعلم۔''

-١٤-

عید گاہ میں سترے کا اہتمام کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید میں اپنے سامنے سترہ رکھنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ:

''أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم كَانَ إِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيدِ أَمَرَ بِالْحِرْبَةِ، فَتُوضَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَيُصَلِّيْ إِلَيْهَا وَالنَّاسُ وَرَائَهُ، وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِيْ السَّفَرِ۔''[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزِ عید [عید گاہ کی طرف] نکلتے، تو اپنے سامنے خنجر گاڑنے کا حکم دیتے۔ پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھاتے اور لوگ آپ کے پیچھے ہوتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں بھی ایسے ہی کرتے۔'' عید گاہ میں نمازِ عید پڑھانے والے حضرتِ ائمہ کو چاہیے، کہ اپنے سامنے سترہ رکھنے کا اہتمام کریں، البتہ اگر عید گاہ میں دیوار وغیرہ کا سترہ موجود ہو، تو تب اور کسی چیز کا سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عید گاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے خنجر کو بطور سترہ گاڑے جانے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''وَذٰلِكَ أَنَّ الْمُصَلّٰى كَانَ فَضَاءً، لَيْسَ شَيْئٌ يُسْتَتَرُ

[1]صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب سترة الإمام سترة من خلفه، جزء من رقم الحديث ٤٩٤، ١/٥٧٣۔

بِہٖ۔''[1]

''اور یہ [خنجر کو سترے کی غرض سے گاڑنا] اس لیے تھا، کیونکہ عید گاہ کھلی جگہ تھی، وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جسے بطور سترہ استعمال کیا جاتا۔''

-۱۵-

نمازِ عید کی رکعتیں

نمازِ عید میں دو رکعت ہیں۔ حضراتِ ائمہ احمد، نسائی اور ابن خزیمہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے فرمایا:

''صَلَاةُ السَّفَرِ رَكْعَتَانِ، وَصَلَاةُ الْأَضْحٰى رَكْعَتَانِ، وَصَلَاةُ الْفِطْرِ رَكْعَتَانِ، وَصَلَاةُ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَانِ، تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ، عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صلي اللهُ عليه وسلم۔''[2]

''نمازِ سفر دو رکعت ہے، نمازِ عید الاضحی دو رکعت ہے، نمازِ عید الفطر دو رکعت ہے اور نماز جمعہ دو رکعت ہے۔ مکمل ہیں قصر نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق۔''[3]

[1]ملاحظہ ہو: سنن ابن ماجہ، أبواب إقامة الصلوات، باب ما جاء في الحربة في يوم العيد، جزء من رقم الحديث ۱۲۹۷، ۱/۲۳۷؛ وصحيح ابن خزيمة، جماع أبواب صلاة العيدين، باب الخبر المفسّر للعلّة في إخراج العنزة إلى المصلّى، جزء من رقم الحديث ۱۴۳۵، ۲/۳۴۴۔ ۳۴۵۔ شیخ البانی نے اسے[صحیح]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: صحيح سنن ابن ماجہ ۱/۲۱۹)۔ [2] المسند، رقم الحديث ۲۵۷، ۱/۳۶۷(ط: مؤسسة الرسالة)؛ وسنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، عدد صلاة العيدين، ۳/۱۸۳؛ وصحيح ابن خزيمة، جماع أبواب صلاة العيدين، باب عدد ركعات صلاة العيدين، رقم الحديث ۱۴۲۵، ۲/۳۴۰۔ الفاظِ حدیث المسند کے ہیں۔ امام نووی نے اسے[حسن]، شیخ البانی نے[صحیح]اور شیخ شعیب ارناؤوط اور ان کے رفقاء نے اس کی[سند کو صحیح]کہا ہے۔(ملاحظہ ہو: المجموع ۵/۲۱؛ وصحيح سنن النسائي ۱/۳۴۳؛ وہامش المسند ۱/۳۶۷)۔ [3] یعنی ان چاروں نمازوں کی دو دو رکعتیں قصر کی وجہ سے نہیں، بلکہ آنحضرت ﷺ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ان کی رکعتوں کی اصل تعداد ہی دو دو ہے۔

-۱۵-

نمازِ عیدین میں تکبیراتِ زائدہ کی تعداد اور وقت

نمازِ عیدین دیگر نماوں کی طرح دو رکعت نماز ہے، البتہ اس میں تکبیراتِ زائدہ ہیں۔ ان تکبیرات کی تعداد اور وقت کے بارے میں مسنون طریقہ یہ ہے، کہ پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد اور قرأت سے پہلے تین اور دوسری رکعت میں کھڑے ہونے کے بعد اور قرأت سے بعد تین تکبیریں کہی جائیں۔

-۱۶-

تکبیراتِ زائدہ کے ساتھ رفع الیدین

عیدین کی تکبیراتِ زائدہ کے ساتھ رفع الیدین کے متعلق میرے ناقص علم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صریح کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اس موقع پر رفع الیدین کو مستحب قرار دینے والے علمائے امت کے دلائل میں سے تین درجِ ذیل ہیں: ا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔ اس بات پر دلالت کرنے والی احادیث میں سے ایک وہ ہے، جسے امام احمد نے حضرت وائل بن حجر حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ انھوں نے بیان کیا، کہ:

''رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم يَرْفَعُ يَدَيْهِ مَعَ التَكْبِيْرِ۔''[2]

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے دیکھا۔''

[1]المصنف، كتاب الصلوات، فيْ التكبير فيْ العيدين واختلافهم فيه، ۲/۱۷۸۔ [2] المسند ۴/۳۱۶۔(ط: المكتب الإسلامي)۔ شیخ البانی نے اسے[حسن]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: إرواء الغليل ۳/۱۱۳)۔

ب: امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق امام بیہقی نے روایت بیان کی ہے، کہ وہ نمازِ عیدین میں تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔[1]

حافظ ابن حجر[التلخیص الجبیر]میں نقل کرتے ہیں:

''قولہ: ''عَنْ عُمَرَ رضى اللهُ عنه أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ التَّكْبِيْرَاتِ'' رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَفِيْهِ ابْنُ لَهِيْعَةَ۔''[2]

"ان کا قول: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت بیان کی گئی ہے، کہ وہ تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے" بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور اس [کی سند] میں ابن لھیعہ ہے۔"

اور حافظ ہیثمی [ابن لھیعہ] کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"ابنُ لَهِيْعَة: وَحَدِيْثُهُ حَسَنٌ وَفِيْهِ ضَعْفٌ۔"[3]

"ابن لھیعۃ: اس کی حدیث حسن ہے اور اس میں ضعف ہے [یعنی ابن لھیعہ میں ضعف ہونے کے باوجود اس کی حدیث [حسن] کے درجہ کی ہے]۔

ج: امام ابن قیم تحریر کرتے ہیں، کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔[4]

-۱۷-

تکبیراتِ زائدہ کے درمیان وقفہ اور ذکر

عیدین کی تکبیراتِ زائدہ کے درمیان میرے محدود علم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی متعین ذکر یا دعا ثابت نہیں، البتہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ

[1]ملاحظہ ہو: السنن الکبریٰ، کتاب صلاۃ العیدین، باب رفع الیدین في تکبیر العید، رقم الروایۃ ۶۱۸۹ و ۶۱۹۰، ۳/۴۱۲۔ ۴۱۳؛ والمغني ۳/۲۷۳۔ [2] التلخیص الحبیر ۲/۸۶۔ [3] مجمع الزوائد ۷/۱۷۱؛ نیز ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۷/۱۷۰۔ [4] ملاحظہ ہو: زاد المعاد ۱/۴۴۳۔

ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے اور اپنے لیے دعا کی جائے۔ امام بیہقی نے علقمہ سے روایت نقل کی ہے، کہ ولید بن عقبہ (حضراتِ صحابہ) ابن مسعود، ابو موسیٰ اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: "عید قریب آچکی ہے، اس میں تکبیرات کس طرح ہیں؟"

عبد اللہ [بن مسعود] رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

تَبْدَأُ فَتُكَبِّرُ تَكْبِيْرَةً تَفْتَتِحُ بِهَا الصَّلَاةَ، وَتَحْمَدُ رَبَّكَ، وَتُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم، ثُمَّ تَدْعُوْ، وَتُكَبِّرُ، وَتَفْعَلُ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ تُكَبِّرُ، وَتَفْعَلُ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ تُكَبِّرُ، وَتَفْعَلُ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ تَقْرَأُ...الخ۔[1]

اللہ اکبر کہہ کر نماز[عید]شروع کرنا۔ اپنے رب کی حمد بیان کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا، پھر دعا کرنا اور اللہ اکبر کہنا اور اسی طرح کرنا۔[2]پھر اللہ اکبر کہنا، اور اسی طرح کرنا۔ پھر اللہ اکبر کہنا اور اسی طرح کرنا۔ پھر اللہ اکبر کہنا پھر قرأت کرنا... الخ

امام بیہقی نے اس روایت کے نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:

''وَہٰذَا مِنْ قَوْلِ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللهُ عنہ مَوْقُوْفٌ عَلَيْہِ، فَنُتَابِعُہٗ فِيْ الْوَقُوْفِ بَيْنَ كُلِّ تَكْبِيْرَتَيْنِ لِلذِّكْرِ، إِذْ لَمْ يُرْوَ خِلَافَہٗ عَنْ غَيْرِہٖ۔''[3]

[1]السنن الکبریٰ، کتاب صلاۃ العیدین، باب یأتیٰ بدعاء الافتتاح عقیب تکبیرۃ الافتتاح، ثم یقف بین کل تکبیرتین یھلل اللہ تعالیٰ، ویکبرہ، ویحمدہ، ویصلي علی النبّي صلي اللہ علیہ وسلم، جزء من رقم الروایۃ ۶۱۸۶، ۳/۴۱۰۔۴۱۱۔ نیز ملاحظہ ہو: المجموع ۵/۲۱؛ والمغني ۳/۲۷۴۔ ۲۷۵؛ والتلخیص الحبیر ۲/۸۶؛ وإرواء الغلیل ۳/۱۱۴۔۱۱۵۔ [2] یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا، نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا اور دعا کرنا۔ [3] السنن الکبریٰ ۳/۴۱۱۔

''یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے اور ہم ہر دو تکبیر کے درمیان ذکر کرنے کے لیے ٹھہرنے کے مسئلہ میں ان کی اتباع کرتے ہیں، کیونکہ اس بارے میں ان کی رائے کے خلاف، کسی[یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم]سے کچھ نقل نہیں کیا گیا۔''

-۱۸-

نمازِ عید کی دو رکعتوں میں قرأت

نمازِ عیدین میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد قرأت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درج ذیل دو طریقے ثابت ہیں:

ا: پہلی رکعت میں سورۃ[ق]اور دوسری میں سورۃ[القمر]پڑھی جائے۔ امام مسلم نے عبید اللہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ: ''أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سَأَلَ أَبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِيَ رضی اللهُ عنہ : ''مَا كَانَ يَقْرَأُ بِہٖ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم فِيْ الْأَضْحٰى وَالْفِطْرِ؟'' فَقَالَ: ''كَانَ صلي اللهُ عليه وسلم يَقْرَأُ فِيْہِمَا[قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ]وَ[اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ]۔'' [1]

''یقیناً عمر بن خطاب نے ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا پڑھا کرتے تھے؟'' تو انھوں نے کہا: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں[قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ]اور

[1]صحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، باب ما يقرأ به في صلاة العيدين، رقم الحديث ١٤-(٨٩١)، ٢/٦٠٧-

[اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ]پڑھا کرتے تھے۔"

ب: پہلی رکعت میں سورۃ[الاعلیٰ]اور دوسری میں سورۃ[الغاشیہ]

پڑھی جائے۔ امام مسلم نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم يَقْرَأُ فِيْ الْعِيْدَيْنِ وَفِيْ الْجُمُعَۃِ[سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلیٰ]وَ[هَلْ أَتَاکَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَۃِ]-'' قَالَ: ''وَإِذَا اجْتَمَعَ الْعِيْدُ وَالْجُمُعَۃُ فِيْ يَوْمٍ وَاحِدٍ، يَقْرَأُ بِہِمَا أَيْضًا فِيْ الصَّلَاتَيْنِ-'' [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عیدوں اور جمعہ میں[سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلیٰ]اور[هَلْ أَتَاکَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَۃِ]پڑھا کرتے تھے۔" انھوں نے[یہ بھی]کہا: "جب عید اور جمعہ ایک دن اکٹھے ہو جاتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں نمازوں میں انہی دونوں سورتوں کی تلاوت فرماتے۔"

-۱۹-

نمازِ عید کا خطبہ سے پہلے ہونا

سنت یہ ہے، کہ پہلے نمازِ عید ادا کی جائے، پھر خطبہ عید شروع کیا جائے۔ اس بارے میں متعدد احادیث میں سے تین درج ذیل ہیں:

ا: امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے کہا:

''شَہِدْتُّ الْعِيْدَ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَ

[1]صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الجمعة، قم الحديث ٦٢-(٨٧٨)، ٢/٥٩٨-

عُثْمَانَ رضى اللهُ عنہم، فَكُلُّہُمْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَ قَبْلَ الْخُطْبَۃِ-''[1]

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ عید کے موقعوں پر حاضر ہوا، وہ سب نماز[عید]خطبہ سے پہلے ادا کرتے تھے۔"

ب: امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

‘‘كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي الله عليه وسلم، وَأَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ رضى اللهُ عنہ يُصَلُّوْنَ الْعِيْدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَۃِ۔’’[2]

‘‘رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہ عیدین کی نماز خطبہ [عیدین] سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔’’

ج: امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

‘‘كَانَ رَسُولُ اللهِ صلي الله عليه وسلم يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰى إِلَى الْمُصَلّٰى، فَأَوَّلُ شَيْئٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلَاةُ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُومُ مُقَابِلَ النَّاسِ ...وَالنَّاسُ جُلُوسٌ... عَلٰى صُفُوفِهِمْ ... فَيَعِظُهُمْ، وَيُوصِيهِمْ، وَيَأْمُرُهُمْ۔ فَإِنْ كَانَ يُرِيدُ أَنْ يَقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَہُ، أَوْ يَأْمُرَبِشَيْئٍ أَمَرَ بِهِ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ۔’’

[1]متفق علیہ: صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخطبۃ بعد العيدين، رقم الحديث ۹۶۲، ۲/۴۵۳؛ وصحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، رقم الحديث ۱۔(۸۸۴)، ۲/۶۰۲۔ الفاظِ حدیث صحیح البخاری کے ہیں۔ [2] متفق علیہ: صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخطبۃ بعد العيدين، رقم الحديث ۹۶۳، ۲/۴۵۲؛ وصحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، رقم الحديث ۸۔(۸۸۸)، ۲/۶۰۵۔ الفاظِ حدیث صحیح البخاری کے ہیں۔

قَالَ أَبُوْ سَعِيدٍ رضى اللهُ عنہ : ‘‘فَلَمْ يَزَلِ النَّاسُ عَلٰى ذٰلِکَ حَتّٰى خَرَجْتُ مَعَ مَرْوَانَ -وَہُوَ أَمِيرُ الْمَدِينَۃِ- فِيْ أَضْحٰى أَوْ فِطْرٍ، فَلَمَّا أَتَيْنَا الْمُصَلّٰى إِذَا مِنْبَرٌ بَنَاهُ كَثِيرُ بْنُ الصَّلْتِ، فَإِذَا مَرْوَانُ يُرِيدُ أَنْ يَرْتَقِيَہُ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ، فَجَبَذْتُ بِثَوْبِہِ، فَجَبَذَنِيْ، فَارْتَفَعَ، فَخَطَبَ قَبْلَ الصَّلَاةِ۔ فَقُلْتُ لَہُ: ‘‘غَيَّرْتُمْ وَاللهِ۔’’ فَقَالَ: ‘‘أَبَا سَعِيدٍ! قَدْ ذَہَبَ مَا تَعْلَمُ۔’’ فَقُلْتُ: ‘‘مَا أَعْلَمُ وَاللهِ! خَيْرٌ مِمَّا لَا أَعْلَمُ۔’’ فَقَالَ: ‘‘إِنَّ النَّاسَ لَمْ يَكُونُوا يَجْلِسُونَ لَنَا بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَجَعَلْتُہَا قَبْلَ الصَّلَاةِ۔’’[1]

‘‘نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحی میں عید گاہ پہنچ کر سب سے پہلے نماز [عید] ادا فرمایا کرتے تھے، پھر [نماز سے فارغ ہو کر] لوگوں کی طرف کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت فرماتے، [نیکی کا] حکم دیتے اور [اس دوران] لوگ اپنی اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی لشکر روانہ کرنا چاہتے یا حکم دینا چاہتے، تو کر دیتے۔ اس کے بعد آپ واپس تشریف لے آتے۔

لوگ اسی طریقے پر کار بند رہے، یہاں تک کہ میں عید الاضحی یا عید الفطر کے موقع پر مدینہ کے گورنر مروان کے ہمراہ عید گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب ہم عید گاہ پہنچے، تو وہاں ایک منبر موجود تھا، جسے کثیر بن صلت نے تعمیر

[1]صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلّى بغير منبر، رقم الحديث ۹۵۶، ۲/۴۴۸۔۴۴۹۔

کیا تھا۔ مروان نے اس منبر پر نماز سے پہلے چڑھنے کا ارادہ کیا، تو میں نے اس کے کپڑے کو کھینچا اور اس نے مجھے کھینچا۔ [تاہم] وہ منبر پر چڑھ گیا اور نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ میں نے اس سے کہا: ‘‘اللہ تعالیٰ کی قسم! تم نے [مسنون طریقہ] کو تبدیل کر دیا ہے۔’’ اس نے کہا: ‘‘ابو سعید! جس بات کا تمھیں علم ہے، وہ تو ختم ہو چکی ہے۔’’ میں نے کہا: ‘‘اللہ تعالیٰ کی قسم! جس بات کا مجھے علم ہے وہ اس بات سے اعلیٰ ہے، جس کا مجھے علم نہیں۔’’ اس نے کہا: ‘‘نماز کے بعد لوگ ہمارے [یعنی ہمارا خطبہ سننے کے] لیے نہیں بیٹھتے تھے، اس لیے میں نے خطبہ کو نماز سے پہلے کر دیا ہے۔’’ اور صحیح مسلم میں ہے:

''قُلْتُ: أَيْنَ الْإِبْتِدَائُ بِالصَّلَاةِ؟'' فَقَالَ: ''لَا، يَا أَبَا سَعِيْدٍ! قَدْ تُرِكَ مَا تَعْلَمُ.'' قُلْتُ: ''كَلَّا، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَا تَأْتُوْنَ بِخَيْرٍ مِّمَّا أَعْلَمُ.''(ثَلَاثَ مِرَارٍ)، ثُمَّ انْصَرَفَ.''[1]

میں نے کہا: "[خطبہ کی بجائے] نماز کے ساتھ آغاز کرنا کہاں گیا؟"

اس نے کہا: "نہیں، اے ابو سعید! جس طریقے کی تجھے خبر ہے، وہ چھوڑا جا چکا ہے۔"

میں نے کہا: "ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس طریقے کا مجھے علم ہے، تم اس سے بہتر طریقہ نہیں لا رہے ہو"(انھوں نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی)، پھر پیچھے ہٹ گئے۔" مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہونے والی باتوں میں سے تین درجِ ذیل ہیں:

[1]صحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، جزء من رقم الحديث ٩-(٨٨٩)، ٢/٦٠٥-

۱: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضراتِ خلفاء ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم عید کی نماز خطبہ عید سے پہلے ادا کرتے تھے۔

۲: نمازِ عید سے پہلے خطبہ دینے کی ابتدا گورنر مدینہ مروان نے کی۔

۳: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے مروان کے اس عمل پر شدید تنقید کی۔ امام نووی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے ارشاد [جس طریقے کا مجھے علم ہے، تم اس سے بہتر طریقہ نہیں لا رہے ہو] کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''هُوَ كَمَا قَالَ لِأَنَّ الَّذِيْ يَعْلَمُ هُوَ طَرِيْقُ النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم، وَكَيْفَ يَكُوْنُ غَيْرُهُ خَيْرًا مِنْهُ؟''[1]

"ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے، کیونکہ جس طریقے کا انہیں علم ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور ان کے مقابلے میں کسی اور کا طریقہ کیونکر اچھا ہو سکتا ہے؟"

علامہ ابن قدامہ [خطبہ عید کے نمازِ عید کے بعد] ہونے کے دلائل نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''فَعَلٰى هٰذَا مَنْ خَطَبَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهُوَ كَمَنْ لَّمْ يَخْطُبْ، لِأَنَّهُ خَطَبَ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّ الْخُطْبَةِ، أَشْبَهَ مَا لَوْ خَطَبَ فِيْ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ.''[2]

[1]شرح النووي ٦/١٧٨- [2] المغني ٣/٢٧٧-

''اس بنا پر جس شخص نے نمازِ عید سے پہلے خطبہ دیا، گویا کہ اس نے خطبہ ہی نہیں دیا، کیونکہ اس نے بے محل خطبہ دیا۔ اس کی مثال قریباً ایسی ہے، کہ وہ جمعہ کا خطبہ، نمازِ جمعہ کے بعد دے۔''

-۲۱-

خطبہ عید میں خواتین کو وعظ و نصیحت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقع پر عورتوں کو وعظ و نصیحت فرمائی۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''قَامَ النَّبِيُّ صلي اللهُ عليه وسلم يَوْمَ الْفِطْرِ، فَصَلّٰى، فَبَدَأَ بِالصَّلَاةِ، ثُمَّ خَطَبَ۔ فَلَمَّا فَرَغَ، نَزَلَ، فَأَتَى النِّسَاءَ، فَذَكَّرَهُنَّ۔''[1]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن نماز پڑھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نماز پڑھائی، پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبہ سے فارغ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس تشریف لائے اور انھیں وعظ و نصیحت فرمائی۔''

امام بخاری نے اس حدیث پر حسبِ ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

[بَابُ مَوْعِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَآءَ يَوْمَ الْعِيْدِ][2]

[امام کا عورتوں کو عید کے دن وعظ و نصیحت کرنا] خطیب حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے عیدین کے موقع پر عورتوں کو وعظ و نصیحت کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ امام عطاء نے جب مذکورہ بالا

[1]متفق علیہ: صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب موعظة الإمام النساء يوم العيد، جزء من رقم الحديث ۹۷۸، ۲/۴۶۶؛ وصحيح مسلم، كتاب صلاة العيدين، جزء من رقم الحديث ۳-(۸۸۵)، ۲/۶۰۳۔ الفاظِ حدیث صحیح البخاري کے ہیں۔ [2] صحيح البخاري، ۲/۴۶۶۔

حدیث اپنے شاگرد ابن جریج کو بتلائی، تو انھوں نے اپنے استاد سے استفسار کیا:

''أَتُرَىٰ حَقًّا عَلَى الْإِمَامِ ذٰلِكَ، وَيُذَكِّرُهُنَّ؟''

''کیا امام پر یہ بات لازم ہے، کہ خطبہ [عید] سے فارغ ہو کر عورتوں کے پاس جا کر انھیں وعظ و نصیحت کرے؟'' انھوں نے جواب میں فرمایا:

''إِنَّهُ لَحَقٌّ عَلَيْهِمْ، وَمَالَهُمْ لَا يَفْعَلُوْنَهُ؟''[1]

"یقیناان پر ایسا کرنا لازم ہے اور انھیں کیا ہو گیا ہے، کہ وہ اس [سنت] پر عمل نہیں کرتے؟"

تنبیہ:

البتہ اب امام کو، البتہ عورتوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی وجہ سے اس کا خطبہ عورتوں میں سنا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس اس لیے تشریف لے گئے تھے، کہ آپ کی آواز انھیں سنائی نہ دی تھی۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انہوں نے بیان کیا:

"أَشْهَدُ عَلٰى رَسُولِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم لَصَلّٰى قَبْلَ الْخُطْبَةِ،"

قَالَ: "ثُمَّ خَطَبَ۔ فَرَاٰى اَنَّهٗ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَآءَ، فَأَتَاهُنَّ، فَذَكَّرَهُنَّ وَوَعَظَهُنَّ۔"[2]

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گواہی دیتا ہوں، کہ آپ نے نماز خطبہ سے پہلے پڑھائی۔" انھوں [یعنی راوی] نے بیان کیا: "پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اور آپ نے خیال فرمایا، کہ آپ عورتوں کو خطبہ نہیں سنا سکے، تو خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں وعظ و نصیحت فرمائی۔" لیکن خطبہ میں اس بات کا اہتمام کیا جائے، کہ اس میں عورتوں کے متعلقہ باتیں شامل ہوں، تاکہ وہ بھی خطبہ عید کے وعظ و نصیحت میں اپنا حاصل کر سکیں۔

[1]صحيح البخاري ۲/۴۶۶؛ وصحيح مسلم ۲/۶۰۳۔ [2] المرجع السابق، كتاب صلاة العيدين، جزء من رقم الحديث ۲ -(--)، ۲/۶۰۲۔

-۲۱-

عید کی مبارک باد

میرے ناقص علم کے مطابق عید کے بعد ایک دوسرے کو مبارک باد کہنے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسا کرنا ثابت ہے۔ ذیل میں اس بارے میں دو روایات توفیقِ الٰہی سے ذکر کی جا رہی ہیں:

۱: علامہ ابن قدامہ نے نقل کیا ہے، کہ حضرت محمد بن زیاد نے بیان کیا:

"كُنْتُ مَعَ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رضي اللهُ عنه وَغَيْرِهٖ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلي اللهُ عليه وسلم، فَكَانُوْا إِذَا رَجَعُوْا مِنَ الْعِيْدِ يَقُوْلُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: "تَقَبَّلَ اللهُ مِنَّا وَمِنْكَ۔"[1]

"میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تھا۔ وہ عید سے واپس آنے پر ایک دوسرے سے کہتے تھے: "[تَقَبَّلَ اللهُ مِنَّا وَمِنْكَ] [اللہ تعالیٰ ہم سے اور تم سے قبول فرمائے]۔

[1]المغني ۳/۲۹۴-۲۹۵۔ امام احمد نے اس روایت کی[سند کو جید]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۳/۲۹۵)۔

۲: حافظ ابن حجر نے جبیر بن نفیر کے بارے میں نقل کیا ہے، کہ انھوں نے کہا:

''كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم إِذَا الْتَقَوْا يَوْمَ الْعِيْدِ يَقُوْلُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: ''تَقَبَّلَ اللهُ مِنَّا وَمِنْكَ۔''[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جب عید کے دن ملاقات کرتے، تو ایک دوسرے سے کہتے تھے:[تَقَبَّلَ اللهُ مِنَّا وَمِنْكَ]۔

-۲۲-

نمازِ عید سے پہلے یا بعد نفلی نماز نہ ہونا

نمازِ عید کی صرف دو رکعتیں ہیں۔ ان سے پہلے یا بعد میں کوئی نفلی نماز نہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت نقل کی ہے:

''أَنَّ النَّبِيَّ صلي اللهُ عليه وسلم صَلّٰى يَوْمَ الْفِطْرِ رَكْعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا۔''[2]

''یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن دو رکعت نماز ادا کی۔ اس سے پہلے یا بعد میں کوئی[اور نفلی] نماز نہ پڑھی۔''

البتہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں نمازِ عید کے بعد مستقل نفلی نماز ادا کرنا چاہے، تو ایسا کرنا سنت سے ثابت ہے۔ امام ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے بیان کیا:

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم لَا يُصَلِّيْ قَبْلَ الْعِيْدِ شَيْئًا۔ فَإِذَا

[1]فتح الباري ۲/۴۴۶۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کی[سند کو حسن]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۲/۴۴۶)۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب الخطبة بعد العيد، جزء من رقم الحديث ۹۶۴، ۲/۴۵۳۔

رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ۔" [1] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہ پڑھتے تھے۔ جب گھر واپس تشریف لے آتے، تو دو رکعت نماز[نفل]ادا کرتے۔"

-۲۳-

عید گاہ سے واپسی پر راستہ بدلنا

سنت یہ ہے، کہ عید گاہ سے واپسی پر جانے والے راستے کی بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا جائے۔ امام بخاری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے کہا:

"كَانَ النَّبِيُّ صلي اللهُ عليه وسلم إِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ۔"[2]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن جاتے وقت ایک راستہ اختیار کرتے اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی حکمت کے بارے میں علمائے امت کے —بقول حافظ ابن حجر— بیس سے زیادہ اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے، کہ روزِ قیامت دونوں راستے آپ کے حق میں گواہی دیں۔ دوسرا قول یہ ہے، کہ دونوں راستوں کے جن و انس آپ کے حق میں گواہی دیں۔ تیسرا قول یہ ہے، کہ دونوں راستوں کے فرشتے آپ کے حق میں گواہی دیں۔ چوتھا قول یہ ہے، کہ اسلامی شعائر کا اظہار دونوں راستوں میں ہو جائے۔

[1]سنن ابن ماجه، أبواب إقامة الصلاة، باب ما جاء في الصلاة قبل صلاة العيد وبعدها، رقم الحديث ۱۲۸۶، ۱/۲۳۵۔ حافظ ابن حجر نے اس کی[سند کو حسن]اور شیخ البانی نے اس[حدیث کو حسن]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۷۶؛ صحيح سنن ابن ماجه ۱/۲۱۷)۔ [2] صحيح البخاري، كتاب العيدين، باب من خالف الطريق إذا رجع يوم العيد، رقم الحديث ۹۸۶، ۲/۴۷۲۔

پانچواں قول یہ ہے، کہ دونوں راستوں میں ذکرِ الٰہی کا اظہار ہو جائے۔ چھٹا قول یہ ہے، کہ منافقوں اور یہودیوں کو جلانے کے لیے۔ ساتواں قول یہ ہے، کہ ان پر اہلِ اسلام کا رعب اور دبدبہ طاری ہو جائے۔ آٹھواں قول یہ ہے، کہ دونوں راستوں کے لوگوں کو آپ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گزرنے کی برکت سے وہ فیض یاب ہو جائیں، اور انھیں آپ سے راہنمائی اور تعاون کا یکساں موقع میسر آجائے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و افعال کی حکمت کے متعلق دو باتیں ہمیشہ مد نظر رکھنا انتہائی ضروری ہیں:

پہلی بات یہ ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق میں سے سب سے بڑے دانا اور حکمت و دانش والے ہیں اور آپ کا کوئی عمل بھی خالی از حکمت نہیں۔

دوسری بات یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی حکمت کچھ بھی ہو، بلکہ آپ کے کسی عمل کی حکمت تک ہماری رسائی نہ بھی ہو سکے، تب بھی یہ بات قطعی اور حتمی ہے، کہ ہماری دین و دنیا کی سعادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بلا چوں وچراں، مکمل اور فوری اتباع میں ہے۔

[1]ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۷۳۔

-۲۴-

چاند کی خبر روزِ عید آنے پر نمازِ عید کا وقت

اگر انتیس رمضان کی شام کو شوال کا چاند بوجہ بادل دیکھا نہ جا سکے اور اگلے دن لوگ تیس رمضان سمجھ کر روزہ رکھ لیں۔ پھر قرب و جوار سے گزشتہ شب چاند نظر آنے کی موثوقہ اطلاع مل جائے، تو لوگ روزہ افطار کر لیں، البتہ نماز کی ادائیگی کے وقت کے متعلق حسبِ ذیل تفصیل پیشِ نظر رکھی جائے:

ا: خبر کا بعد از زوال آنا:

ایسی صورت میں نمازِ عید اس کے اگلے دن ادا کریں۔ امام احمد نے حضرت ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ انھوں نے کہا، کہ: ''میرے چچاؤں نے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصاری ساتھیوں میں سے تھے، مجھے یہ حدیث بتلائی:

''غُمَّ عَلَيْنَا هِلَالُ شَوَّالٍ۔ فَأَصْبَحْنَا صِيَامًا، فَجَائَ رَكْبٌ مِنْ آخِرِ النَّهَارِ، فَشَهِدُوْا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم أَنَّهُمْ رَأَوْا الْهِلَالَ بِالْأَمْسِ۔ فَأَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم أَنْ يُفْطِرُوْا مِنْ يَوْمِهِمْ، وَأَنْ يَخْرُجُوْا لِعِيْدِهِمْ مِنَ الْغَدِ۔''[1]

''شوال کا ہلال ابر کی وجہ سے دکھائی نہ دیا۔ ہم نے (دوسرے دن کی) صبح کو روزہ رکھ لیا۔ پھر دن کے آخر میں سواروں کی ایک جماعت آئی اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو یہ گواہی دی، کہ انھوں نے کل چاند دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا، کہ وہ روزہ کھول دیں اور اگلے دن نماز عید کے لیے نکلیں۔''

بعض علمائے امت کی رائے اس سے مختلف ہے۔ امام خطابی ان کی رائے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

’’قُلْتُ: ’’سُنَّةُ رَسُوْلِ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم أَوْلىٰ، وَحَدِيْثُ أَبِيْ عُمَيْرٍ

[1]الفتح الرباني لترتيب مسند الإمام أحمد بن حنبل، كتاب الصيام، باب من يكتفي بشهادته برؤية الهلال في الصوم والفطر، رقم الحديث ٥٢، ٩/٢٦٥۔ ٢٦٦۔ شیخ احمد البنا نے تحریر کیا ہے، کہ حضراتِ ائمہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، طحاوی اور دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے۔ امام دار قطنی نے اس کی[سند کو حسن]کہا ہے۔ امام بیہقی نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اسے[حسن]قرار دیا ہے۔(ملاحظہ ہو: بلوغ الأماني ٩/٢٦٦)۔ شیخ شعیب ارناؤوط اور ان کے رفقاء نے اس کی[سند کو جید]کہا ہے۔(ملاحظہ ہو: هامش المسند ٣٤/١٩١)۔

صَحِيْحٌ، فَالْمَصِيْرُ إِلَيْهِ وَاجِبٌ۔‘‘[1]

’’میں نے کہا: ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سب سے بلند و بالا ہے، ابو عمیر کی حدیث صحیح ہے، لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔‘‘

ب: خبر کا قبل از زوال آنا:

اگر زوال سے پہلے چاند دیکھنے کی اطلاع مل جائے اور زوال سے قبل نمازِ عید پڑھنا ممکن ہو، تو اسی دن زوالِ آفتاب سے پہلے نمازِ عید ادا کر لی جائے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب۔

-۲۵-

نمازِ عید ادا نہ کر سکنے والے شخص کی نماز

جو شخص بوجہ عذر یا بلا عذر نمازِ عید ادا نہ کر سکے وہ کیا کرے؟ اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صریح بات میرے ناقص اور محدود علم کے مطابق ثابت نہیں، البتہ علمائے امتM کے اقوال میں سے دو درج ذیل ہیں: ا: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق ایسا شخص چار رکعت نماز ادا کرے۔ انھوں نے فرمایا:

’’مَنْ فَاتَهُ الْعِيْدُ مَعَ الْإِمَامِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا۔‘‘[2]

[1]معالم السنن ١/٢٥٢۔ [2] فتح الباري ٤/٤٧٥۔ حافظ ابن حجرلکھتے ہیں: ’’اسے سعید بن منصور نے[صحیح سند]کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے‘‘(المرجع السابق ٤/٤٧٥)؛ نیز ملاحظہ ہو: مصنف ابن أبيْ شيبہ، كتاب الصلوات، الرجل تفوته الصلاة في العيد كم يصلي؟، ٢/١٨٣۔

’’جو امام کے ساتھ [نماز] عید نہ پڑھ سکے، وہ چار رکعت پڑھے۔‘‘

ب: امام بخاری کی رائے میں ایسا شخص امام کی طرح دو رکعت ادا کرے۔ انھوں نے اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے عمل، اور حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

‘‘بَابُ إِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ، وَكَذٰلِكَ النِّسَآئُ، وَمَنْ كَانَ فِيْ الْبُيُوْتِ وَالْقُرٰى لِقَوْلِ النَّبِيِّ صلي الله عليه وسلم : ‘‘هٰذَا عِيْدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ’’؛ وَأَمَرَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رضى اللهُ عنه مَوْلَاهُمْ ابْنَ أَبِيْ عُتْبَةَ بِالزَّاوِيَةِ، فَجَمَعَ أَهْلَهَ وَبَنِيْهِ، وَصَلّٰى كَصَلَاةِ أَهْلِ الْمِصْرِ وَتَكْبِيْرِهِمْ-[1]

وَقَالَ عِكْرَمَةُ: ‘‘أَهْلُ السَّوَادِ يَجْتَمِعُوْنَ فِيْ الْعِيْدِ، يُصَلُّوْنَ رَكْعَتَيْنِ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ-’’[2]

وَقَالَ عَطَائُ: ‘‘إِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ[3]-’’[4]

‘‘اس بارے میں باب، کہ جس شخص کی نماز عید رہ جائے، وہ دو رکعت نماز پڑھے۔

اور اسی طرح عورتیں اور گھروں اور دیہاتوں میں موجود دوسرے لوگ (بھی دو رکعت نماز ادا کریں) کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ‘‘یہ ہم مسلمانوں کی عید ہے۔’’[5]

[1]نیز ملاحظہ ہو: مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلوات، ۲/۱۸۳۔ [2] نیز ملاحظہ ہو: المرجع السابق، في القوم يكونون فيْ السواد، فتحضر الجمعة أو العيد، ۲/۱۹۱۔ [3] نیز ملاحظہ ہو: المرجع السابق، في الرجل تفوته الصلاة مع الإمام، عليه التكبير ۲/۱۹۲۔ [4] صحيح البخاري، كتاب العيدين، ۲/۴۷۴۔ [5] اس حدیث سے امام بخاری کے استدلال کا سبب بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے: حدیث شریف میں عید کی اضافت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے، کہ عید بعض لوگوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ وہ سب کی ہے اور چونکہ عید کی عبادت نمازِ عید ہے، اس لیے اس میں سب کا حصہ ہونا چاہیے۔(ملاحظہ ہو: رسالۃ شرح تراجم أبواب صحيح البخاري(المطبوع مع صحيح البخاري) ص ۲۷۔

مقام زاویہ[1] میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حکم پر ان کے غلام ابن ابی عتبہ نے ان کے اہل و عیال کو جمع کیا اور انھوں نے سب کو نمازِ عید شہر والوں کی طرح تکبیراتِ (زائدہ) کے ساتھ پڑھائی۔ اور عکرمہ نے فرمایا: ‘‘دیہاتوں والے لوگ جمع ہو کر اسی طرح دو رکعت نمازِ عید ادا کریں گے، جیسے کہ امام (شہر میں) نمازِ عید پڑھاتا ہے۔’’ اور عطاء نے فرمایا:

‘‘جب اس کی نمازِ عید رہ جائے، تو وہ دو رکعت پڑھے۔’’

اس بارے میں ایک دوسرا سوال یہ ہے، کہ دو یا چار رکعتیں کہاں ادا کرے؟ اس سلسلے میں امام احمد سے سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا:

‘‘إِنْ شَائَ مَضٰى إِلَى الْمُصَلّٰى، وَإِنْ شَآئَ حَيْثُ شَآئَ-’’[2]

) [1]الزاویہ): بصرہ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ وہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا محل اور کھیت تھے اور وہ وہاں کثرت سے قیام فرمایا کرتے تھے۔(ملاحظہ ہو: فتح الباري ۲/۴۷۵)۔ [2] المغني ۳/۲۸۵۔

‘‘اگر چاہے، تو عید گاہ جا کر ادا کرلے، اور اگر کسی اور جگہ ادا کرنا پسند کرے، تو وہیں پڑھ لے۔’’

عیدین کے دونوں دنوں میں روزہ کی ممانعت

عید الفطر اور عید الاضحی کے دونوں دنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث میں سے دو درج ذیل ہیں: ا: امام بخاری اور امام مسلم نے ابو عبید مولیٰ بن ازہر سے روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے کہا: "میں عید کے موقع پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حاضر ہوا۔ انھوں نے فرمایا:

''هٰذَانِ يَوْمَانِ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم عَنْ صِيَامِهِمَا:

يَوْمُ فِطْرِكُمْ مِنْ صِيَامِكُمْ، وَالْيَوْمُ الْآخَرُ تَأْكُلُوْنَ فِيْهِ مِنْ نُسُكِكُمْ.''[1]

"ان دو دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا: تمہارے روزے چھوڑنے کا دن (روزوں سے فارغ ہونے کا دن) اور دوسرا دن، جس میں تم اپنی قربانیوں [کے گوشت] سے کھاتے ہو۔"

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"یہ حدیث عیدین کے دونوں دنوں میں روزے رکھنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے، وہ روزے خواہ نذر کے ہوں، یا کفارہ کے، یا نفلی یا حج تمتع کے، اور اس بات پر اجماع ہے۔"[2]

ب: امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے، کہ انھوں نے بیان

[1]متفق علیہ: صحیح البخاري، کتاب الصوم، باب صوم یوم الفطر، رقم الحدیث ۱۹۹۰، ۴/۲۳۹؛ وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النهي عن صوم یوم الفطر ویوم الأضحٰی، رقم الحدیث ۱۳۸-(۱۱۳۷)، ۲/۷۹۹۔ الفاظِ حدیث صحیح البخاري کے ہیں۔ [2] فتح الباري ۴/۲۳۹۔

کیا:

''نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صلي اللهُ عليه وسلم عَنْ صَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ وَيَوْمِ الْأَضْحٰى.''[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو روزوں سے منع فرمایا: عید الفطر اور عید الاضحی کے دنوں کے۔"

امام نووی نے لکھا ہے:

''وَقَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى تَحْرِيْمِ صَوْمِ هٰذَيْنِ الْيَوْمَيْنِ

بِكُلِّ حَالٍ، سَوَاءٌ صَامَهُمَا عَنْ نَذْرٍ أَوْ تَطَوُّعٍ أَوْ كَفَّارَةٍ أَوْ غَيْرِ ذٰلِكَ۔''[2]

''ان دو دنوں میں کسی بھی قسم کے روزے رکھنے کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے، خواہ کوئی شخص یہ روزے نذر کے پورا کرنے کی نیت سے رکھے، یا نفلی روزوں کی نیت سے، یا کفارہ کی نیت سے، یا کسی اور نیت سے۔''

ممانعت کی حکمت:

علمآء لکھتے ہیں: ''وَالْحِكْمَةُ فِيْ النَّهْيِ عَنْ صَوْمِ الْعِيْدَيْنِ أَنَّ فِيْهِ إِعْرَاضًا عَنْ ضِيَافَةِ اللهِ تَعَالىٰ لِعِبَادِهِ۔''[3]

''ان دو دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت میں حکمت یہ ہے، کہ اس (یعنی ان دو روزوں کے رکھنے) میں اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے لیے (تیار کردہ) ضیافت سے اعراض ہے۔''

[1]صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب النهي عن صوم يوم الفطر ويوم الأضحٰى، رقم الحديث ١٤٣-(١١٤٠)، ٢/٨٠٠۔ [2] شرح النووي ٧/١٥
[3]نيل الأوطار ٤/٣٥١-٣٥٢۔

شرائع قدیمہ اور نماز، قرآن کریم میں

1۔ دعاے حضرت خلیل علیہ السلام :

﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾[إبراهيم:40]

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میری آل و اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنادے۔''

2 اوصفِ حضرت اسماعیل علیہ السلام:

﴿وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا﴾[مريم:55]

''وہ اپنے اہل خانہ کو نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم فرمایا کرتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے۔''

3 میثاقِ بنی اسرائیل :

1-﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾[البقرة:83]

''اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو۔''

2-﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾[البقرة:43]

"اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع (نماز ادا) کرو۔"

3-﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلاَّ عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾[البقرة:45]

"اور صبر و نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد حاصل کرو اور یہ بڑا بھاری کام نظر آتا ہے، مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے (بہت آسان ہے)۔"

4 حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکمِ الٰہی:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾[طٰہٰ:14]

"اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔"

5 حضرت مریم بنت عمران کو حکمِ الٰہی:

﴿يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِىْ وَ ارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾[آل عمران:42]

"اے مریم! اپنے رب کے حضور عاجزی سے کھڑی ہو اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔"

6 حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وصیتِ الٰہی:

﴿وَ اَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾[مریم:31]

"اور (میرے رب نے) مجھے نماز و زکات کی وصیت فرمائی ہے کہ تاحینِ حیات ان کی پابندی کروں۔"

7 حضرت زکریا علیہ السلام کی نماز:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ﴾[آل عمران:39]

"فرشتوں نے انھیں (زکریا) کو اُس وقت پکارا جبکہ وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔"

8 حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیت:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾[لقمان:17]

"اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روک اور (اس راہ میں) جو مشکلات آئیں، ان پر صبر کر، بے شک یہ بڑی عزیمت و ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

9شریعتِ اسلامیہ اور نبی علیہ السلام کو حکمِ الٰہی:

﴿وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْھَا﴾[طٰہٰ:132]

"اور آپ اپنے اہلِ خانہ (اور امت) کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر قائم رہیے۔"

3۔ترکِ نماز کا انجام، قرآن کریم میں

1-﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ﴾ [التوبۃ:11]

"پھر اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو یہ تمھارے دینی بھائی ہیں (ورنہ اسلامی برادری سے ان کا کوئی تعلق نہیں)۔"

2- ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَ جَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَ احْصُرُوْھُمْ وَ اقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾[التوبۃ:5]

"مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ، قتل کر دو اور انھیں پکڑ کر قید کر لو اور گھیر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کو درستی سے پڑھنے لگیں اور زکات دیا کریں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

3- ﴿فَخَلَفَ مِنْم بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا﴾[مریم:59]

"پھر ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین بنے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی، قریب ہے کہ وہ غی (جہنم) سے دوچار ہوں گے۔"

4- ﴿مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ وَاتَّقُوْہُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ [الروم:31]

"اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور درستی سے نماز ادا کرتے رہو اور یہ شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ۔"

5- ﴿کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ فِیْ جَنّٰتٍ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ۔۔۔﴾[المدثر:38 تا 43]

"ہر شخص اپنے کرتوتوں کی پاداش میں گرفتار رہے گا، سوائے دائیں ہاتھ (میں اعمال ناموں) والوں کے، وہ جنت میں مجرموں سے سوال کرتے ہوں گے کہ تمھیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی، وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔۔۔ الخ۔"

6۔ ﴿فَلاَ صَدَّقَ وَلاَ صَلّٰی وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾[القیامۃ:31-32]

"نہ اس نے تصدیق کی، نہ نماز پڑھی بلکہ تکذیب کی اور پیٹھ پھیری۔"

7۔ ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ ارْکَعُوْا لاَ یَرْکَعُوْنَ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ﴾ [المرسلات:48-49]

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (نماز کے لیے) جھکو تو وہ نہیں جھکتے، اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ویل خرابی ہو گی۔"

8۔ ﴿فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلاَتِھِمْ سَاھُوْنَ﴾[الماعون:4-5]

"ہلاکت اور بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے، جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔"

4۔ نماز کے لیے اذان و اقامت، قرآن کریم میں

1۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[الجمعۃ:9]

"اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن تمھیں نماز کے لیے نِدا (اذان) دی جائے تو اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف جلدی کر کے پہنچو اور کاروبارِ تجارت کو چھوڑ دو، تمھارے لیے یہی بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔"

2۔ ﴿وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ﴾[المائدۃ:58]

"اور جب تم نماز کے لیے بلاتے (اذان کہتے) ہو تو یہ لوگ اس کا مذاق اُڑاتے اور اسے کھیل تماشا بناتے ہیں، یہ اس لیے کہ یہ بے عقل قوم کے لوگ ہیں۔"

5۔ نماز کے لیے ستر پوشی اور عام حجاب کے احکام، قرآن کریم میں

ارشادِ الٰہی ہے:

1۔ ﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾[الأعراف:31]

"اے آدم علیہ السلام کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (لباس) اختیار کرو۔"

مرد و زن کے لیے "مقامِ ستر" کی حدود کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آگئی ہے، جو آگے اپنے مقام پر آرہی ہے۔

2۔ ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلاَ يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾[النور:31]

"اور (اے نبی!) مومن عورتوں سے فرما دیجیے کہ وہ اپنی نظر بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ (سُسر)، ان کے اپنے بیٹے، ان کے شوہروں کے بیٹے (دوسری بیویوں سے)، ان کے بھائی، ان کے بھائیوں کے بیٹے (بھتیجے)، ان کی بہنوں کے بیٹے (بھانجے)، ان کے اپنے میل جول کی عورتیں اور ان کے لونڈی غلام اور وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی (نفسانی) غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو، اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اور اے ایمان والو! تم سب کے سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔"
اس آیت کی ضروری تفسیر "نماز کے لیے مرد و زن کے لباس" کے ضمن میں آئے گی۔

3۔ ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِىْ لاَ يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ وَّاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾[النور:60]

"اور جو عورتیں جوانی سے گزر بیٹھی ہوں اور نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں، تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

4۔ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَ قَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾[الأحزاب:32-33]

"اے نبی کی بیویو! تم دوسری عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو (غیر مردوں سے) دبی زبان (باریک آواز) سے بات نہ کرو (ایسا کرو گی تو) جس کے دل میں کھوٹ ہے، اس کے دل میں لالچ پیدا ہو گا، لہٰذا کھڑی کھڑی صاف صاف بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں جمی رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔"

5۔ ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْم بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا﴾[الأحزاب:53]

"اور جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے کوئی چیز مانگنے جاؤ تو پردے کے پیچھے سے مانگ لو، اس میں خوب ستھرائی ہے، تمھارے اور ان کے دلوں کے لیے۔" اور فرمایا:

6۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ [الأحزاب:59]

"اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور عام مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بڑی چادریں اوڑھ لیں اور اس سے امید ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں کوئی نہیں چھیڑے گا اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

6۔ تعمیر مساجد، قرآن کریم میں

1 مشرکین کی بے بسی اور مومنین کا شعار:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِیْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِی النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَی الزَّكٰوةَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ﴾[التوبۃ:17-18]

"مشرکین کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر کفر کو، ان کے تمام اعمال برباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ نارِ جہنم میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے، جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو، نماز قائم کرتا ہو اور زکات ادا کرتا ہو اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو، سو امید ہے کہ وہ لوگ ہدایت والوں میں سے ہوں گے۔"

2 مساجد کا تقدّس :

1۔ ﴿وَ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾[الجن:18]

"اور بلاشبہ یہ مساجد اللہ کے گھر ہیں، لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی غیر اللہ کو ہرگز نہ پکارو۔"

2۔ ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ﴾[النور:36]

"(ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں، جن کو بلند کرنے کا اور جن میں اس کے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے، ان میں لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔"

3۔ ﴿وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ [الأعراف:29]

"اور ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو، دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔"

4۔ ﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ﴾[الأعراف:31]

"اے بنی آدم! ہر عبادت کے وقت اپنی زینت (لباس) سے آراستہ رہو۔"

3 دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر "اللہ" کا:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ [آل عمران:96-97]

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی، وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے، اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو گیا، امن میں آ گیا اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

4 مساجد کی نظافت و صفائی:

5۔ ﴿وَ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ﴾[البقرۃ:125]

"اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھنا۔"

6۔ ﴿وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰہِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا وَّ طَہِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡقَآئِمِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ﴾ [الحج:26]

"اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔"

اللہ نے شرک جیسی معنوی غلاظت سے مساجد کی نظافت و پاکیزگی اور عام گندگی سے صفائی ستھرائی ہر دو کا حکم فرمایا ہے۔

5 مسجدِ ضرار:

7۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًام بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾[التوبۃ:107]

"اور کچھ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی، اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں اور اس میں (بندگی کے بجائے) کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (بہ ظاہر اس عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں، جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے، وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا، مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔"

نماز کے لیے ضروری لباس

پانی، غسل، طہارت و وضو، تیمم اور اقامتِ نمازِ پنج گانہ کی تفصیلات ذکر کرنے کے بعد مسائلِ نماز کا آغاز، نماز کی اہمیت و فضیلت کے بیان سے کیا گیا تھا، جس کے ضمن ہی میں ترکِ نماز اور عدمِ پابندیِ نماز پر وعید اور پھر تارکِ نماز کا حکم بھی قدرے تفصیل سے آ گیا ہے۔ نماز ادا کرنے کے طریقے اور احکامِ ادا سے پہلے اب آیئے! نماز کے لیے ضروری لباس کے بارے میں اسلامی احکام و مسائل تلاش کریں، کیونکہ جس طرح بدن کی طہارت و پاکیزگی واجب بلکہ بعض کے نزدیک قبولیتِ نماز کی شرط ہے، اسی طرح لباس کا بھی پاک ہونا اگر شرط نہیں تو کم از کم واجب ضرور ہے۔[1]

نماز کے لیے طہاتِ لباس :

لباس کی طہارت و نظافت کی طرف تو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم قرآنِ مجید میں بطورِ خاص توجہ دلائی ہے، چنانچہ سورۃ المدثر کے آغاز میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر:1 تا 4]

"اے کپڑا اوڑھنے والے! اٹھیے اور (لوگوں کو عذابِ الٰہی سے) ڈرایئے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھیے۔" مفسّرین لکھتے ہیں کہ یہاں کپڑوں کی طہارت سے مراد حسی و اخلاقی یا ظاہری و باطنی ہر طرح کی طہارت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ (اللہ کی بڑائی بیان کرنے اور) نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کا پاک صاف ہونا بھی ضروری ہے۔[2]

[1]نيل الأوطار (1/ 2/ 121) الروضة الندية (1/ 80) [2] أشرف الحواشي مولانا محمد عبده (ص: 687) نیز دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (4/ 440-441-دار المعرفة بیروت)

نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت و نظافت کے التزام کا پتا درج ذیل احادیث سے بھی لگتا ہے۔ 1۔ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہا تھا:

{أُصَلِّيْ فِي الثَّوْبِ الَّذِيْ آتِيْ فِيْهِ أَهْلِيْ؟}

"کیا میں اس کپڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں، جسے پہن کر میں اپنی اہلیہ سے جماع کرتا ہوں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{نَعَمْ، إِلَّا أَنْ تَرَىٰ فِيْهِ شَيْئاً فَتَغْسِلُهُ} [1]

"ہاں (پڑھ سکتے ہو) سوائے اس کے کہ اگر تم اس میں کچھ لگا دیکھو تو اسے دھو لو۔" 2۔ دوسری حدیث تبویبِ بخاری میں اشارتاً اور سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور مسندِ احمد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

{هَلْ كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ فِي الثَّوْبِ الَّذِيْ يُجَامِعُ فِيْهِ؟}

"کیا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کپڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جماع کرتے تھے؟"

تو انھوں نے جواباً فرمایا:

{نَعَمْ، إِذَا لَمْ يَكُنْ فِيْهِ أَذًى} [2]

"ہاں (پڑھ لیتے تھے) بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ لگی ہو (جسے دھونا یا کھرچنا ضروری ہوتا ہے)۔"

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ وہ لباس جس کی موجودگی میں جماع کیا گیا ہو، وہ ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ پاک ہی رہتا ہے، ہاں اگر اسے کچھ لگ جائے تو اسے اس جگہ سے دھو لیا جائے۔

[1] فقہ السنۃ (1/ 124) المنتقیٰ مع النیل (1/ 2/ 119) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (542) [2] بحوالہ جات بالا، صحیح البخاري مع الفتح (1/ 465) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (352) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (283) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (540) صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (237)

اسی سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ جس بچھونے پر ایسا کیا جائے، وہ بچھونا بھی ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ لباس کی طرح وہ بھی پاک ہی رہتا ہے، ہاں اگر کچھ نظر آئے تو اس جگہ کو دھو دینا کافی ہے۔" [1]

3۔ تیسری حدیث سنن ابو داود، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

{إِنَّهُ صلى الله عليه وسلم صَلَّى فَخَلَعَ نَعْلَيْهِ،فَخَلَعَ النَّاسُ نِعَالَهُمْ}

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور (دورانِ نماز ہی) اپنے جوتے اتار دیے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھا دیکھی) لوگوں نے بھی جوتے اتار دیے۔" جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر پھرے تو پوچھا:

{لِمَ خَلَعْتُمْ؟} "تم نے جوتے کیوں اتارے تھے؟"

تو لوگوں نے کہا:

{رَأَيْنَاكَ خَلَعْتَ فَخَلَعْنَا}

"ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے اتار دیے ہیں، لہٰذا ہم نے بھی اتار دیے۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{إِنَّ جِبْرِيْلَ أَتَانِيْ فَأَخْبَرَنِيْ إِنَّ بِهِمَا خَبَثًا}

"مجھے تو جبرائیل علیہ السلام نے آکر بتایا تھا کہ جوتوں کو کوئی نجاست لگی ہوئی ہے (لہٰذا میں نے اتار دیے تھے)۔" آیندہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقل ایک اصول وضع فرما دیا اور فرمایا:

{فَإِذَا جَآءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيُقَلِّبْ نَعْلَيْهِ،وَلْيَنْظُرْ فِيْهِمَا،فَإِنْ رَأَى خَبَثًا فَلْيَمْسَحْهُ بِالْأَرْضِ،ثُمَّ لْيُصَلِّ فِيْهِمَا} [1]

"جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو اسے چاہیے کہ اچھی طرح الٹ پلٹ کر کے اپنے جوتوں کی پڑتال کرے اور انھیں اچھی طرح دیکھ لے، اگر وہ ان میں کوئی نجاست لگی دیکھے تو اسے اچھی طرح زمین پر رگڑ لے اور پھر ان میں نماز پڑھ لے۔" اس حدیث سے پتا چلا کہ جوتوں سمیت بھی نماز ہو جاتی ہے، بشرطیکہ انھیں کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو اور اگر کچھ لگا ہو تو اسے زمین پر رگڑنے ہی سے نجاست زائل ہو جائے گی اور نماز کے لائق ہو جائیں گے۔ البتہ اس معاملے میں ممکنہ حد تک احتیاط کی ضرورت ہے اور اگر کوئی مکمل احتیاط کو اختیار کر کے جوتوں میں نماز پڑھتا ہے تو دیکھنے والوں کو بلاوجہ شور نہیں برپا کر دینا چاہیے، کیونکہ یہ عمل خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت اور جائز ہے۔[2]

بہر حال یہ تمام احادیث نماز کے لیے لباس (اور جوتوں) کی طہارت و نظافت کے التزام کی دلیل ہیں۔

مَردوں کے لیے ریشم کا لباس:

لباس کی طہارت و پاکیزگی کے لیے ایک بنیادی بات تو یہ بھی ہے کہ اس لباس کا مواد کسی ایسی چیز پر مبنی نہ ہو، جس کا پہننا شریعتِ اسلامیہ میں حرام قرار دیا گیا ہو، مثلاً مَردوں کے لیے ریشم

[1]صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (605) موارد الظمآن للهيثمي،رقم الحديث (360) [2] اس سلسلے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث دیکھنے کے لیے ملاحظہ کریں: صحيح البخاري (1/ 494) باب الصلاة في النعال.

کے لباس کا استعمال حرام کیا گیا ہے تو اگر کسی نے ریشم کا لباس پہن رکھا ہو تو اس میں اس کی نماز نہیں ہو گی، جبکہ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات بھی مردوں کے لیے اس کا پہننا ناجائز اور گناہ ہے۔ لیکن عورتوں کے لیے نماز اور غیر نماز ہر موقع کے لیے یہ جائز ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

{لَا تَلْبَسُوا الْحَرِيْرَ ،فَإِنَّهُ مَنْ لَبِسَهُ فِيْ الدُّنْيَا،لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ}[1]

"ریشم کا کپڑا مت پہنو! بے شک جس نے دنیا میں ریشم پہنا، وہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔" صحیحین ہی کی ایک دوسری حدیث میں جو سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِيْ الدُّنْيَا فَلَنْ يَّلْبَسَهُ فِيْ الآخِرَةِ}[2]

"جس نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا، وہ آخرت میں اسے نصیب نہیں ہو گا۔"

ان احادیث میں جو مذکور ہے کہ اسے آخرت میں ریشم نصیب نہیں ہو گا، اس کا معنٰی صرف یہ نہیں کہ چلیے جی آخرت میں یہ نصیب نہ ہو گا تو نہ سہی، کوئی دوسرا کپڑا ہی سہی۔ بلکہ آخرت میں اس کے نصیب نہ ہونے کی شرح میں اس کے کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں، چنانچہ ان احادیث کی شرح کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"یہ دونوں حدیثیں ریشم کا لباس پہننے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حدیث کے شروع میں ممانعت کے الفاظ کا وارد ہونا حقیقتاً اس کے حرام ہونے کا تقاضا کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے اسے دنیا میں پہن لیا تو وہ آخرت میں اسے نہیں پہنے گا۔"

بظاہر یہ اس کے جنت میں داخل ہی نہ ہو سکنے کا کنایہ ہے، کیوں کہ (سورۃ الحج، آیت:23

[1]صحيح البخاري مع الفتح،رقم الحديث (5830) مختصر صحيح مسلم للمنذري،رقم الحديث (1336) صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (2258) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4898) [2] صحيح البخاري مع الفتح،رقم الحديث (5832) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 4/ 51) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث (3588)

میں اور سورۃ الفاطر، آیت:33 میں)اللہ تعالیٰ کا اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَلِبَأْسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾"اور جنت میں ان کا لباس ریشم ہو گا۔" پس جس نے دنیا میں ریشم پہنی وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔امام نسائی و احمد رحمہ اللہ نے یہ معنیٰ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

{وَمَنْ لَّمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ}[1]

"جسے آخرت میں یہ نصیب نہ ہوئی،وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔" امام نسائی رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی قسم وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا اور پھر اسی آیت کو ذکر کیا۔البتہ سنن نسائی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مسند طیالسی میں مرفوعاً مروی ہے کہ اگر وہ جنت میں داخل ہو گیا تو لوگ وہاں ریشم پہنیں گے، مگر یہ نہیں پہن پائے گا۔"[2]

لیکن یہ مرفوعاً ضعیف ہے۔[3] اسی بات پر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد کی وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

{إِنَّمَا يَلْبَسُ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا مَنْ لَّا خَلَاقَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ}[4]

"دنیا میں وہی ریشم پہنتا ہے، جسے آخرت میں یہ نصیب نہ ہونے والی ہو۔" صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

{لَا تَلْبَسُوْا الْحَرِيْرَ فَإِنَّهُ مَنْ لَّبِسَهُ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ}[5]

ریشم مت پہنو! جس نے دنیا میں ریشم پہنی تو آخرت میں اسے نصیب نہ ہو گی۔"

انہی الفاظ پر مبنی ایک حدیث حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی گزری ہے، جو اس موضوع کی

[1]إرواء الغليل (1/ 309) وصححہ [2] نيل الأوطار (1/ 2/ 82) فتح الباري (10/ 288) [3] كما في غاية المرام (ص: 66) [4] صحيح البخاري مع الفتح،رقم الحديث (5835) مختصر صحيح مسلم للمنذري،رقم الحديث (1335) صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (3408)

صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4899) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث (3591) [5] صحيح الجامع (3/ 6/ 180) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 44)

پہلی حدیث ہے۔

عورتوں کے لیے ریشم اور سونے کی اجازت:

ان احادیث سے بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ریشم مرد وزن سب کے لیے ہی ممنوع ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض دیگر احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ عورتوں کے لیے ان کا استعمال جائز ہے، چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، مسند احمد، مسند طیالسی، معجم طبرانی، مستدرکِ حاکم اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

{أُحِلَّ الذَّهَبَ وَالْحَرِيْرَ لِلْأُنَاثِ مِنْ أُمَّتِيْ وَحُرِّمَ عَلَىٰ ذُكُوْرِهَا} [2]

"سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال کیے گئے ہیں اور یہ مردوں پر حرام کیے گئے ہیں۔" ایسی ہی دیگر احادیث کی بنا پر اس بات پر اجماع امت نقل کیا گیا ہے کہ ریشم مَردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔[3]

سونے اور ریشم کو مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال قرار دینے والی ایک حدیث سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، معانی الآثار طحاوی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

{أَخَذَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم حَرِيْرًا فِيْ يَمِيْنِهٖ،وَأَخَذَ ذَهَبًا فَجَعَلَهٗ فِيْ شِمَالِهٖ}

[2] المنتقىٰ (1/ 2/ 83) صحيح الجامع (1/ 119) والإرواء (1/ 305) مصنف عبدالرزاق (11/ 68 و مسند أحمد (4/ 392) بحوالہ تحقیق المصابیح (3/ 196) صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (1404) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4754) و صحيح الجامع،رقم الحديث (209) [3] نيل الأوطار (1/ 2/ 82)

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پکڑی اور دائیں ہاتھ میں رکھ لی اور سونا پکڑا اپنے بائیں دستِ مبارک میں رکھ لیا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُوْرِ أُمَّتِيْ} [1]

"یہ دونوں چیزیں میری امت کے مَردوں پر حرام ہیں۔" سنن ابن ماجہ میں ساتھ ہی یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

{حِلٌّ لِّأُنَاثِهِمْ} [2] "یہ ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔"

سنن کبریٰ بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک تیسری حدیث مروی ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کو مَردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔[3]

اِن احادیث کے پیشِ نظر صرف اس بات کی طرف اشارہ ہی کرنا کافی لگتا ہے کہ ہمارے وہ دوست، بھائی اور بزرگ جو مرد ہو کر بھی سونے کی انگوٹھیاں، چین، ٹاپس اور لاکٹ وغیرہ پہنے پھرتے ہیں اور شادی کی انگوٹھی سمجھ کر سجائے پھرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مردوں کے لیے حرام ہے، شادی کی نشانی ہو یا کسی دوسری تقریب کی۔

ریشم ملا کپڑا:

البتہ یہ تو معاملہ ہے، مطلق ریشم یا خالص ریشم کے کپڑے کا جبکہ اگر کوئی کپڑا ایسا ہو، جس میں تانا یا بانا دونوں میں سے کوئی ایک چیز ریشم کی ہو، یعنی کسی کپڑے کا نصف مواد ریشم کا اور نصفِ ثانی کسی دوسری چیز کاٹن وغیرہ کا ہو تو اس کا حکم مَردوں کے لیے خالص ریشم کے کپڑے والا ہی ہے، حتیٰ کہ اگر کسی کپڑے میں بنائی کے وقت ریشم کے تاروں کی پٹیاں بنائی گئی ہوں جو نصف سے اگرچہ کم ہوں، مگر وہ ریشم مجموعی طور پر کپڑے میں کافی مقدار میں ہو جائے تو وہ بھی ممنوع ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم

[1]صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (3422) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4750) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث (3595) صحيح ابن حبان،رقم الحديث (1465) [2] غاية المرام وصححہ بمجموع طرقہ (ص: 64-66) نيل الأوطار (1/ 2/ 84) الإرواء (1/ 308،307) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث 3595) [3] إرواء الغليل (1/ 308)

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

{أُهْدِيَتْ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليہ وسلم حُلَّةٌ سِيَرَاءُ فَبَعَثَ بِهَا إِلَيَّ فَلَبِسْتُهَا فَعَرَفْتُ الْغَضَبَ فِيْ وَجْهِہٖ}

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ریشم کی آمیزش و ملاوٹ کا حلّہ تحفہ دیا گیا، وہ حلّہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیج دیا تو میں نے وہ پہن لیا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس سے غصے کے آثار محسوس کر لیے۔" (پوچھنے پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{إِنِّيْ لَمْ أَبْعَثْ بِهَا إِلَيْکَ لِتَلْبَسَهَا،إِنَّمَا بَعَثْتُ بِهَا إِلَيْکَ لِتُشَقِّقَهَا خُمُراً بَيْنَ النِّسَاءِ}[1]

"میں نے یہ حلّہ اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ اسے تم پہن لو، بلکہ میں نے تو یہ اس لیے بھیجا تھا کہ تم اسے پھاڑ کر گھر کی عورتوں کے دوپٹے بنالو۔" ایک اور روایت میں ہے:

"فَشَقَقْتُہٗ بَيْنَ نِسَائِيْ" "تو میں نے اسے پھاڑ کر گھر کی خواتین میں تقسیم کر دیا۔"

ایک روایت میں ہے:

{بَيْنَ الْفَوَاطِمِ}[2]

"میں نے وہ حلّہ پھاڑ کر فاطماؤں میں تقسیم کر دیا۔" وہ فاطمائیں کون تھیں؟

1۔ ان میں سے ایک تو خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا تھیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ تھیں۔

2۔ دوسری فاطمہ بنت اسد تھیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ 3۔ تیسری فاطمہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہما تھیں۔

4۔ علامہ ابن عبد البر اور عبد الغنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی خواتین میں سے ایک چوتھی فاطمہ بھی

[1]المنتقىٰ (1/ 2/ 84) مشكاة المصابيح (2/ 1242) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 49،50) صحيح البخاري،رقم الحديث (2614)
[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 50)

ذکر کی ہیں، جو فاطمہ بن شیبہ بن ربیعہ تھیں۔ یہ قاضی عیاض اور علامہ رسلان کے افادات ہیں۔[1]

اس حدیث میں ریشم کے حلے کے لیے جو لفظ "سیراء" آیا ہے، اس کی تشریح و تفہیم میں اہلِ علم و لغت کے مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً قاموس میں ہے:
1۔ یہ ایسی چادریں ہیں، جس میں ریشم، پیتل اور خالص سونے کے ریشے استعمال کیے گئے ہوں۔

2۔ امام خطابی، خلیل اصمعی اور ابو داود نے کہا ہے کہ یہ ایسی چادریں ہیں، جن میں ریشمی تانا ہو۔

3۔ ازہری نے کہا ہے کہ مختلف رنگوں والی چادر کو "سیراء" کہتے ہیں۔

4۔ مالک نے کہا ہے کہ ریشم ملا کپڑا ہے۔ 5۔ جوہری کا کہنا ہے کہ وہ کپڑا جس میں پیتل کی تاریں یعنی ریشے استعمال ہوں۔

6۔ کسی نے خالص ریشم کو "سیراء" کہا ہے۔[2]

اس حدیث سے ریشم ملے کپڑے کو مَردوں کے لیے استعمال کی حرمت اور عورتوں کے لیے حلّت معلوم ہو گئی۔ ماہرینِ لغتِ عرب کی ان تصریحات کی رُو سے تو "سیراء" اس کپڑے ہی کو کہا جاتا ہے، جو خالص ریشم کا نہیں بلکہ ریشم کے امتزاج سے بنا ہو اور اگر اسے خالص ریشم کا مان لیا جائے تو پھر اس کی حرمت میں کوئی کلام ہی نہیں رہ جاتا۔

ریشم کی جائز مقدار:

ریشم کا کسی کپڑے میں کتنا استعمال جائز ہے؟ اس سلسلے میں بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ اگر کسی کپڑے میں دو انگلیوں یا تین انگلیوں، حد چار انگلیوں کے برابر ریشم استعمال کیا گیا ہو تو وہ جائز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

{إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم نَهىٰ عَنْ لُبُوْسِ الْحَرِيْرِ إِلَّا هٰكَذَا،وَرَفَعَ لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِصْبَعَيْهِ الْوُسْطَىٰ وَالسَّبَابَةَ وَضَمَّهُمَا}[3]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم کے لباس سے منع فرمایا، سوائے اتنے کے اور (مقدار کی

[1]نيل الأوطار (1/ 2/ 85) [2] نيل الأوطار (1/ 2/ 85) و فتح الباري (19/ 297) [3] صحيح البخاري مع الفتح (10/ 1284) رقم الحديث (5829) المنتقىٰ (1/ 2/ 87) مشكاة المصابيح (2/ 1242) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 46)

وضاحت کے لیے) نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی درمیانی اور شہادت والی انگلیوں کو اُٹھایا اور ان دونوں کو باہم ملایا۔" جبکہ صحیح مسلم، سنن اربعہ، مسندِ احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے:

{نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ إِلَّا مَوْضِعَ إِصْبَعَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً أَوْ أَرْبَعَةً}[1]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا، سوائے دو انگلیوں یا تین انگلیوں یا چار انگلیوں کے مساوی مقدار کے۔" سنن ابو داود اور مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں:

{وَأَشَارَ بِكَفِّهِ}[2] "اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کی ہتھیلی سے اشارہ فرمایا۔" اس حدیث کی ان مختلف روایات کے مجموعی مفہوم نے جواز کی مقدار واضح کر دی کہ اگر کسی کپڑے پر ریشم کی کڑھائی وغیرہ اتنی ہو، جس کی مقدار چار انگلیوں کے برابر ہو جائے تو ایسے کپڑے کے استعمال میں مَردوں کے لیے بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ البتہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔[3]

بیمار اور خارش زدہ کے لیے جواز:

یہاں ایک اور بات بھی ذکر کر دیں کہ بعض اوقات مجبوری کی شکل میں ریشم کا کپڑا پہننے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً کوئی بیمار ہو خصوصاً خارش زدہ ہو تو اسے ریشم کا لباس پہننے کی اجازت ثابت ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

{إِنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم رَخَّصَ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِيْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ لِحَكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا}[4]

[1]صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 48) صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (341) صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (1405) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4905-4906) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث (3593) [2] فتح الباري (10/ 288) [3] جائز مقدار کی تفصیل مطلوب ہو تو نيل الأوطار (1/ 2/ 89 تا 92) اور فتح الباري شرح صحيح البخاري (10/ 285 تا 291) اور دیگر شروح احادیث اور کتبِ فقہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ [4] صحيح البخاري مع الفتح (10/ 295) المنتقىٰ (1/ 2/ 88) مشكاة المصابيح (2/ 1242) غاية المرام (ص: 69) ولم يذكر سنن ابن ماجہ،صحيح البخاري مع الفتح،رقم الحديث (5839) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 52-53) صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (3421) صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (1406) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4903-4904) سنن ابن ماجہ،رقم الحديث (3592)

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہما کو خارش کا مرض ہونے کی وجہ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔'' جبکہ ترمذی شریف کے الفاظ اور بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک غزوے کے موقع پر حضرت عبد الرحمن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہما نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جوئیں پڑ جانے کی شکایت کی تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ریشم کی قمیص پہننے کی رخصت عطا فرمائی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: ''انھیں خارش کی تکلیف جوؤں کے اثر سے ہو گئی تھی اور امام طبری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کسی کو کوئی تکلیف ہو جو ریشم کا لباس پہننے سے کم ہو جائے تو وہ شخص ریشم کے استعمال کی ممانعت میں داخل نہیں ہو گا۔''[1]

جمہور اہلِ علم کے نزدیک خارش اور جوؤں کے لیے ریشم پہنی جا سکتی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے اختلاف کیا ہے، جبکہ یہ صحیح حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ دوسری بیماریاں (جن میں ریشم مفید ہو سکتی ہو) وہ بھی انھی پر قیاس کی جا سکتی ہیں اور ان کے لیے بھی یہ جائز ہے۔[2]

ریشم کے بچھونے:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح ریشم کا لباس منع ہے، اس کے بچھونے بنانا اور ان پر بیٹھنا بھی اسی طرح ممنوع و حرام ہے، جس طرح اس کا پہننا ہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

{نَهَانَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم أَنْ نَّشْرَبَ فِيْ آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ،وَأَنْ نَّأْكُلَ فِيْهَا،وَأَنْ

[1]فتح الباري (10/ 295) [2] نيل الأوطار (1/ 2/ 89)

نَّجْلِسَ عَلَيْهِ}[1]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے منع کیا کہ ہم سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھائیں اور پیئیں اور اس سے بھی کہ ہم اس پر بیٹھیں۔" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بخاری کی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی رو سے جمہور اہلِ علم کے نزدیک ریشم کے بچھونے پر بیٹھنا بھی حرام ہے اور بعض فقہانے کچھ قیاسی قسم کے دلائل سے ریشم کے بچھونے پر بیٹھنے کا جواز کشید کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن صاحبِ نیل الاوطار نے ان کی اس دلیل کو نص کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے باطل قرار دیا ہے۔

ایسے ہی صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

{نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَنِ الْجُلُوْسِ عَلَى الْمَيَاثِرِ}

"مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم و دیباج کے بچھونوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔" آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "المیاثر" کی تشریح بھی خود ان الفاظ سے کی ہے کہ "میاثر" ریشم ملے وہ بچھونے ہیں جو عورتیں اپنے شوہروں کے لیے سواری پر ڈالنے کے لیے بناتی تھیں، جو سرخ ارجوانی (سرخ رنگ) کی چادروں جیسے ہوتے تھے۔[2]

صحیح بخاری میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ تفسیر مذکور ہے، لیکن ایک باب کے ترجمے میں تعلیقاً آئی ہے، اس باب کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں، جو صحیح مسلم میں بھی مروی ہے اور ترمذی میں بھی اور شرح السنہ میں بھی، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

{نَهَانَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم عَنِ الْمَيَاثِرِ الْحُمُرِ وَعَنِ الْقِسِّيِّ}[3]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دیباج کے بچھونوں اور ریشم ملے لباس سے منع فرمایا۔"

[1]صحيح البخاري مع الفتح (10/ 291) المنتقىٰ (1/ 2/ 85) مشكاة المصابيح (2/ 1241) [2] المنتقىٰ (1/ 2/ 86) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4969) [3] صحيح البخاري مع الفتح (10/ 292) والنيل أيضاً و صحيح الجامع (3/ 6/ 58) مشكاة المصابيح (2/ 1248) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4770) سنن ابن ماجه،رقم الحديث (3654) صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (3417) عن علي رضى الله عنه،صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (1442) عن البراء،و الصحيحة،رقم الحديث (2396) صحيح مسلم مع شرح النووي (7/ 14/ 31) عن البراء۔

اور "منتقی الأخبار" میں علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر محمول کی جائے گی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریشمی قبا کو اس کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے پہنا تھا، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تو گمان کرنا بھی روا نہیں کہ حرمت کا حکم نازل ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قبا پہنی ہو اور اس میں نماز بھی پڑھی ہو۔[1]

اکثر فقہا حرمت کے بجائے اس کی کراہت کے قائل ہیں، یعنی ریشمی کپڑے میں نماز پڑھنا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے اور ان کا استدلال اس سے ہے کہ حرمت کی علّت تو غرور و تکبر ہے، جبکہ نماز میں غرور و نخوت نہیں ہوتی۔ لیکن صاحبِ نیل الاوطار کہتے ہیں کہ ان کا غرور کو علت بنا کر حرمت کی نص کو غیر نماز کے لیے مخصوص کرنا ایک ایسا فعل ہے جو قابل التفات ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ ریشم کے کپڑے میں نماز کو جائز قرار دیتے ہیں اور وہ اُسی حدیثِ عقبہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ریشمی قبا میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز پڑھنا مذکور ہے، اس حدیث سے وہ یوں دلیل لیتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ریشمی قبا میں نماز ادا فرمائی تو یہ جواز کی دلیل ہے۔ ہاں اگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کو قبا اتارنے کے بعد دہراتے، تو پھر ریشمی کپڑے میں نماز پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوتی تھی، جب کہ ان کا یہ استدلال بھی قابل قبول نہیں، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو اس لیے نہیں دُہرایا تھا، کیوں کہ وہ نماز اس کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے اس قبا میں پڑھی گئی تھی۔ حرمت کا حکم نازل ہو جانے کے بعد بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ریشمی کپڑے کو پہننا اور نماز بھی اس میں پڑھنا، اس بات کا تو وہم و گمان بھی روا نہیں، بلکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسی بدگمانی کسی گستاخی سے کم ہرگز نہیں ہوگی اور پھر اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ وہ نماز ریشم کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے ریشمی قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی، کیونکہ صحیح مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ سے مروی ہے:

{صَلَّى فِيْ قُبَا دِيْبَاجٍ ثُمَّ نَزَعَهٗ،وَقَالَ:نَهَانِيْ جِبْرِيْلُ}[2]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی قبا میں نماز پڑھی، پھر اُسے اتار دیا اور فرمایا کہ مجھے جبرائیل علیہ السلام نے اس سے منع کر دیا ہے۔"

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نماز ریشم کے کپڑے میں نماز کی ممانعت کا حکم نازل ہونے سے پہلے پڑھی تھی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دہرایا نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث قائلینِ جواز کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی۔ حرمت کے نزول سے پہلے ریشم کا استعمال جائز رہا ہے یا نہیں؟ تو اس سوال کا جواب بعض احادیث سے مل جاتا ہے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

{إِنْ أَكِيْدَرَ دُوْمَةَ أَهْدٰى إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم جُبَّةَ سُنْدُسٍ أَوْ دِيْبَاجٍ قَبْلَ أَنْ يُّنْهَىٰ عَنِ الْحَرِيْرِ،فَلَبِسَهَا فَتَعَجَّبَ النَّاسُ مِنْهَا}

"اکیدر دومۃ الجندل نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سندس یا دیباج (اقسامِ ریشم) کا جبہ بطورِ ہدیہ بھیجا، قبل اس کے کہ ریشم سے منع کیا گیا (یعنی ریشم کی ممانعت کا حکم نازل ہونے سے پہلے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جبہ پہنا تو (اس کی نفاست اور عمدگی پر) لوگ تعجب کرنے لگے۔"

تب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لِمَنَادِيْلُ سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ فِيْ الْجَنَّةِ أَحْسَنُ مِنْهَا}[1]

"مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، سعد کو جنت میں جو رومال دیے جائیں گے، وہ تو اس سے بھی زیادہ اچھے ہوں گے۔" اس حدیث میں جہاں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی بشارت اور ان کی فضیلت وارد ہوئی ہے، وہیں یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ پہلے ریشم کا استعمال حرام نہیں تھا، بلکہ یہ حکم بعد میں نازل ہوا تھا۔ یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی، نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2]

لیکن بادئ الامر میں ریشم کے حرام نہ ہونے کی جو صراحت مسند احمد میں ہے، وہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، اسی بنا پر ہم نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہی نص ذکر کی ہے، البتہ اگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور انھیں جنت کی بشارت کا موضوع ہوتا تو صحیحین کے الفاظ کو ترجیح دینا ضروری تھا۔

[1]صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4895) [2] صحيح البخاري مع الفتح (7/ 122) صحيح مسلم مع شرح النووي (8/ 22،16-24) سنن الترمذي مع التحفة (10/ 346) صحيح الجامع الصغير (3/ 6/ 95) صحيح سنن النسائي،رقم الحديث (4895)

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کا مسلکِ تحریم کافی قوی ہے۔ حتیٰ کہ "البحر" میں کہا گیا ہے کہ اگر ریشمی کپڑے کے سوا دوسرا کوئی کپڑا موجود ہی نہ ہو تو اس میں نماز صحیح ہے، تاکہ دونوں طرح کی احادیث میں موافقت ہو جائے اور اگر ریشم کا کپڑا ہوتے ہوئے کوئی شخص عریاں ہو کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر صرف ریشم کا کپڑا ہی پاس ہو، دوسرا کوئی نہ ہو تو عریاں ہی نماز پڑھ لے، بالکل اسی طرح جیسے کسی کے پاس کپڑا تو ہو مگر وہ نجس و پلید ہو۔ لیکن یہ تو تب ہے جب کپڑوں کی طہارت کو صحتِ نماز کے لیے شرط مانا جائے، جبکہ دلائلِ قویہ کی رُو سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے طہاتِ لباس کو شرط نہیں بلکہ واجب قرار دیا ہے کہ ترکِ واجب کے گناہ کے ساتھ ساتھ نماز صحیح ہو گی۔[1]

علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ "الروضۃ الندیۃ شرح الدر البہیۃ" میں لکھتے ہیں کہ جمہور اہلِ علم کا مذہب یہ ہے کہ نماز کے لیے بدن، کپڑوں اور جگہ کا پاک ہونا واجب ہے۔ بعض نے شرط اور بعض نے سنت بھی کہا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ واجب ہے، لہٰذا جس نے جان بوجھ کر نجاست والے پلید کپڑوں سے نماز پڑھ لی، اس نے ایک واجب فعل کو ترک کیا، لیکن اس کی نماز صحیح ہو گی۔[2]

اس سے ریشم کے کپڑے میں پڑھی گئی نماز کا حکم بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نماز تو ہو جائے گی، البتہ حرمتِ ریشم اور ترکِ واجب کا ارتکاب شمار ہو گا، یہی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جمہور کے مذہب کے طور پر بیان فرمائی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ریشم کے کپڑے میں کوئی نماز مجبوراً پڑھی گئی اور اس نماز کا وقت ہوتے ہوئے ہی دوسرا کپڑا مل گیا تو اس نماز کو دُہرانا چاہیے۔[3]

لیکن اس سلسلے میں جمہور کا مسلک ہی اقرب و اعدل ہے۔

نماز میں ستر عورہ :

تیسری بات جو نماز کے لائق لباس کے لیے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مرد و زن ہر دو کا لباس ساتر ہونا چاہیے کہ وہ اعضا جن کا نماز میں ڈھانپنا ضروری ہے، وہ اس لباس میں ڈھانپے گئے ہوں، کیونکہ سورت اعراف آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ﴾[الأعراف:31]

"اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو۔" یاد رہے کہ اس آیت میں جو دو لفظ ہیں: مسجد اور زینت۔ ان سے متبادر مفہوم تو یہی لگتا ہے کہ مسجد میں جاتے وقت زینت اختیار کر کے جانا چاہیے، لیکن یہاں مسجد سے مراد محض مسجد ہی نہیں بلکہ نماز پڑھنے اور طواف کرتے وقت زینت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ تفسیر جلالین میں ﴿عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ﴾ کا معنیٰ و مفہوم متعین کرنے کے لیے لکھا ہے: "عِنْدَ الصَّلَاةِ وَالطَّوَافِ"[1] "(زینت اختیار کر لیا کرو) نماز پڑھتے اور طواف کرتے وقت۔" نماز کے ساتھ طواف بھی اس لیے شامل ہے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ آیت ان مشرکین کی تردید کے لیے نازل ہوئی ہے، جو عریاں ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، تفسیر ابن جریر (واللفظ لہٗ) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کا سبب و شانِ نزول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كَانُوْا يَطُوْفُوْنَ بِالْبَيْتِ عُرَاةً، الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَالرِّجَالُ بِالنَّهَارِ وَالنِّسَاءُ بِاللَّيْلِ"

"وہ مرد و زن بیت اللہ شریف کا طواف عریاں ہو کر کیا کرتے تھے، مرد دن کے وقت اور عورتیں رات کے وقت۔" ان میں کوئی عورت تو یہاں تک بھی کہتی تھی ع

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ أَوْ كُلُّهٗ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أُحِلُّهٗ

"آج جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہو یا سارا جسم اور جو بھی ظاہر ہو میں اُسے (دوسروں کے لیے اس کا دیکھنا) حلال نہیں کرتی ہوں۔" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ﴾[الأعراف:31] [2]

[1]تفسير الجلالين (ص: 197،196 دار المعرفة بيروت) [2] صحيح مسلم مع شرح النووي (9/ 18/ 162)

"ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ امام مجاہد، عطا، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، قتادہ، سدی اور ضحاک نے بھی ایسے ہی کہا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ اور کتنے ہی دوسرے ائمہ سلف سے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ننگے ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا کرتے تھے۔[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول اس آیت اور اس کے معنیٰ میں وارد شدہ احادیث کے پیشِ نظر ہر نماز خصوصاً جمعہ و عید کے لیے تجمل اور اختیارِ زینت مستحب ہے اور تجمّل و زینت سے مراد کوئی میک اپ کرنا نہیں، بلکہ امام ابن جریر طبری نے ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ﴾ کا معنیٰ کیا ہے: ''اِلْبَسُوْا الثِّيَابَ''[2] ''کپڑے پہنو۔''

تفسیر جلالین میں لکھا ہے:

''مَا يَسْتُرُ عَوْرَتَكُمْ''[3] ''جو تمھاری شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالے ''حجاب المرأۃ ولباسھا في الصلاۃ'' میں جو پہلی فصل قائم کی ہے، وہ ہے:

''فَصْلٌ فِي اللِّبَاسِ لِلصَّلَاةِ'' ''نماز کے لیے لباس کا بیان۔''

پھر لکھا ہے کہ یہی ہے ہر نماز و مسجد کے لیے زینت اختیار کرنا، جسے فقہا کہتے ہیں:

''بَابُ سَتْرِ الْعَوْرَةِ فِيْ الصَّلَاةِ''[4] ''نماز میں ستر عورۃ کا بیان۔''

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ زینت اختیار کرنے سے اصل مراد نماز کے لیے ساتر لباس پہننا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ فقہا کی زبان میں جو ستر عورہ کی اصطلاح معروف ہے، بہ ظاہر اس کا معنیٰ تو یہ ہے کہ نماز میں شرم گاہ کو ڈھانپا جائے، لیکن عورت یا شرم گاہ سے مراد محض

[1]تفسیر ابن کثیر (2/ 210) و تفسیر مجاہد از مولانا عبدالرحمن سواتی (ص: 235 طبع قطر) و فتح الباري (1/ 465) باب وجوب الصلاۃ في الثیاب،وقول اللہ تعالیٰ: {خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ} و مختصر تفسیر الطبري (ص: 168) [2] مختصر تفسیر الطبری حوالہ بالا۔ [3] تفسیر الجلالین (ص: 196) [4] حجاب المرأۃ (ص: 14)

اُردو زبان کے لفظ شرم گاہ کا مدلول نہیں بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے، کیونکہ اُردو میں تو اس لفظ کا مدلول بہت محدود یعنی جائے پیشاب و پاخانہ ہے، جبکہ فقہ میں اس میں کئی اعضاے جسم بھی شامل ہیں، البتہ تہذیب السنن میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بعض اعضا کو عورۃ مغلّظہ اور بعض کو عورۃ خفیفہ کہا جاتا ہے، اور یہ صرف مَردوں کی نسبت ہے اور نماز میں ان سب کا ستر ضروری ہے۔''[1]

مَردوں کا مقامِ ستر:

ظاہر ہے کہ نماز کے لیے مرد و زن کے ''ستر'' میں کافی فرق ہے، آیئے! اس سلسلے میں پہلے دیکھیں کہ نماز کے لیے مَردوں کا مقامِ ستر کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنیادی طور پر تو عورۃ مغلّظہ یعنی جائے پیشاب و جائے پاخانہ ہیں، جو اُردو زبان میں شرم گاہ کا مدلول ہیں اور ان کے مقام ستر ہونے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس کے علاوہ جو رانیں ہیں، ان کے مقام ستر ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے، تو آیئے، اس سلسلے میں جانبین کے دلائل کا مطالعہ کریں۔

رانوں کو مقام ستر کہنے والوں کے دلائل:

آیئے! پہلے اس فریق کے دلائل دیکھیں جن کے نزدیک یہ اعضاے جسم یعنی رانیں مقام ستر ہیں، چنانچہ ان کا استدلال ایک تو اس حدیث سے ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقًا، تاریخ امام بخاری، مستدرکِ حاکم اور مسندِ احمد میں موصولاً حضرت محمد بن جحش رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

{مَرَّ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَلَىٰ مَعْمَرٍ وَ فَخِذَاهُ مَكْشُوْفَتَانِ}

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے، جبکہ ان کی دونوں رانیں ننگی تھیں۔" تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: {غَطِّ فَخِذَيْكَ فَإِنَّ الْفَخِذَيْنِ عَوْرَةٌ} [2]

[1]تہذیب السنن (6/ 17) الإرواء (1/ 301) [2] صحيح البخاري مع الفتح (1/ 478) بلفظ: ((الفخذ عورة)) المنتقىٰ (1/ 2/ 63) صحيح الجامع،رقم الحديث (4157) مسند أحمد (5/ 290) مستدرک الحاكم (4/ 180) و سنن البيهقي (2/ 228) بحواله تحقيق مصابيح السنة (2/ 407)

"اپنی رانیں ڈھانپ لو، بے شک رانیں مقام ستر ہیں۔" نیز ان کا استدلال ایک دوسری حدیث سے ہے، جو صحیح بخاری میں تعلیقًا، سنن ابو داود، ترمذی، دار قطنی، موطا امام مالک اور صحیح ابن حبان میں حضرت جرہد اسلمی رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

{مَرَّ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَعَلَيَّ بَرْدَةٌ،وَقَدِ انْكَشَفَتْ فَخِذِيْ}

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے جبکہ میں ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا، جس سے میری ران ننگی ہو چکی تھی۔" تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{غَطِّ فَخِذَكَ فَإِنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ} [1]

"اپنی ران ڈھانپو، بے شک ران مقام ستر ہے۔" تیسری دلیل بخاری شریف کے ترجمۃ الباب میں تعلیقًا اور سنن ترمذی و صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک میں موصولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

{اَلْفَخِذُ عَوْرَةٌ}[2] "ران مقام ستر ہے۔"

مسند احمد میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا، جس کی ران ننگی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

{غَطِّ فَخِذَيْکَ فَإِنَّ فَخِذَ الرَّجُلِ مِنْ عَوْرَتِہٖ}[3]

"اپنی رانوں کو ڈھانپ لو، کیونکہ آدمی کی رانیں اس کے مقام ستر میں سے ہیں۔" ان کے موقف کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو سنن ابی داود، دار قطنی، بیہقی، مسند احمد اور تاریخ بغداد خطیب میں حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مروی ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

{...فَإِنَّ مَا أَسْفَلَ عَنْ سُرَّتِہٖ إِلٰی رُكْبَتِہٖ مِنْ عَوْرَتِہٖ}

[1]صحيح البخاري مع الفتح (1/ 570) سنن الدارقطني (1/ 1/ 224) مع التعليق المغني،صحيح سنن أبي داود،رقم الحديث (3389) صحيح سنن الترمذي (2245) موارد الظمآن،رقم الحديث (353) [2] صحيح سنن الترمذي،رقم الحديث (2245) صحيح الجامع،رقم الحديث (4280) [3] صحيح البخاري (1/ 478) المنتقىٰ (1/ 2/ 63) صحيح الجامع،رقم الحديث (4158)

"بے شک ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں تک کا درمیانی سارا حصہ ہی مقام ستر ہے۔"

جبکہ ان میں سے بعض روایات کے الفاظ ہیں: {مَا بَيْنَ السُّرَّةِ وَالرُّكْبَةِ عَوْرَةٌ}[1] "ناف اور گھٹنوں کے مابین کا درمیانی سارا حصہ مقام ستر ہے۔

نمازِ قصر

مشہور مقولہ ہے کہ "سفر وسیلۂ ظفر ہے۔" ممکن ہے بعض پہلوؤں سے یہ بات صحیح ہو، کیونکہ مسند احمد میں ایک حدیث ہے:

((سَافِرُوْا تَصِحُّوْا،وَاغْزُوْا تَسْتَغْنُوْا))

"سفر کرو! صحت مند رہو گے اور جہاد کرو! غنی ہو جاؤ گے۔"

علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفر اور غزوے کو ایک ساتھ ملانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سے سفر جہاد مراد ہے۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔[1] علامہ البانی نے اسے ضعیف شمار کیا ہے۔[2]

لیکن حبیب کبریا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشادِ گرامی سے تو کچھ اور ہی بات مترشح ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سفر کو عذاب کا ایک حصّہ قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد، موطا امام مالک، سنن ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ،يَمْنَعُ اَحَدَكُمْ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ وَنَوْمَهٗ،فَاِذَا قَضٰى اَحَدُكُمْ نَهْمَتَهٗ مِنْ وَجْهِهٖ فَلْيُعَجِّلِ الرُّجُوْعَ اِلٰى اَهْلِهٖ))[3]

"سفر عذاب کا ایک حصّہ ہے۔ وہ تم میں سے ہر کسی کو (بروقت) کھانے پینے اور نیند (وآرام کرنے) سے روکتا ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص (سفر کا باعث بننے والی) ضرورت پوری کرلے تو اسے چاہیے کہ پھر جلد اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ جائے۔"

[1]مشكاة المصابيح(3/ 29)صحيح البخاري(3/ 103)الفتح الرباني(4/ 130) [2] الفتح الرباني(4/ 132،131)نيل الأوطار(2/ 3/ 113)سنن الترمذي(2/ 419)شرح السنة(3/ 282)مشكاة المصابيح(3/ 41)و صححه الألباني(1/ 322)

سفر میں سہولتیں:

سفر انسانی زندگی کا ایک جزو ہے اور مذکورہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے یہ باعثِ مشقت بھی ہوتا ہے۔ آج چاہے سفر کی بے شمار سہولتیں مہیا ہیں، مگر مجموعی طور پر مشقت سفر ایک حقیقت ہے۔ ہمارے دینِ اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ یہ دین فطرت ہے اور انسانی احوال کے مطابق ہی احکام دیتا ہے، جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سفر کی مشقتوں کے پہلو کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ کریم میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث شریفہ میں اپنے ماننے والوں کو بہت سی آسانیاں عطا کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دورانِ سفر چار فرضوں والی نمازوں کی صرف دو رکعتیں پڑھ لے۔ ظہر و عصر اور پھر اسی طرح مغرب و عشا کو جمع کر کے کسی ایک کے وقت میں دونوں کو ہی ادا کرلے تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ نمازوں کی متعلقہ موکدہ و غیر موکدہ سنتیں نہ پڑھے تو کوئی مواخذہ نہیں، بلکہ کھلی رخصت ہے۔ البتہ فجر کی سنتیں اور نمازِ وتر سفر کے دوران میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ لیا کرتے تھے، جو ان دونوں کی فضیلت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح سردیوں کے موسم میں مقامی آدمیوں کے لیے موزوں یا جرابوں پر مسح کی مدت چوبیس گھنٹے مگر مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، ہمارا دین انتہائی فطرتی و آسان ہے۔

نماز قصر کے دلائل:

ہمارے پیش نظر اس وقت یہاں دینِ اسلام کی خصوصیات و امتیازات میں سے صرف ایک ہی پہلو ہے اور وہ ہے نمازِ قصر یعنی نمازِ دو گانہ۔

1۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا﴾[النساء:101]

"اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر نماز میں قصر و اختصار کر لو (خصوصاً) جبکہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے، کیونکہ وہ کھلم کھلا تمھاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔"

بہ ظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر صرف "خوف" کے وقت ہی جائز ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے پتا چلتا ہے کہ قصر ہر سفر میں جائز ہے، خواہ اس میں کوئی خوف ہو یا اس کا شائبہ تک بھی نہ ہو۔ "خوف" کے اوقات کی نماز جنگی حالات کے مطابق مختلف احوال میں مختلف انداز سے پڑھی جاتی ہے، جسے "صلاۃ الخوف" کہا جاتا ہے، جس کے بعض ضروری احکام و مسائل بھی ہم بعد میں ذکر کریں گے، ان شاء اللہ۔ بلا خوف و خطر سفر میں قصر کرنے کے عدمِ جواز کا جو شبہہ مذکورہ آیت کے آخری کلمات سے ہو سکتا ہے، اس کا ازالہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرما دیا ہے۔

صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ لوگ اب تک سفر میں قصر کیے جا رہے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتا ہے کہ "جب تم سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر نماز میں قصر کر لو جبکہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے۔" آج خوف کی یہ حالت باقی نہیں رہی۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ نے فرمایا:

((عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ))فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَقَالَ:((صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللهُ بِهَا عَلَيْكُمْ،فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهُ))[1]

"جس چیز پر آپ کو تعجب ہو رہا ہے خود مجھے بھی اس پر تعجب ہوا تھا اور میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ ایک صدقہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے، لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو۔"

قصر کی رکعتیں:

قصر کرنے پر ہر نماز کی کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں؟اس کی وضاحت صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، مسند احمد اور سنن بیہقی میں موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (شروع میں) نماز کی دو رکعتیں فرض کی گئی تھی، پھر چار کر دی گئیں، لیکن سفر کی نماز پہلے فرضوں جتنی (دو رکعتیں) ہی رہیں۔[2]

[1]نيل الأوطار(2/ 3/ 110)شرح السنة(3/ 86)المحلّى لابن حزم(2/ 4/ 170) [2] المرعاة(3/ 32)

یہ تو ظہر و عصر اور عشا کی نمازوں کے بارے میں صریح ہے کہ سفر میں ان کی صرف دو دو رکعتیں ہی پڑھی جائیں گی، جبکہ فجر کی ہوتی ہی دو ہیں اور مغرب کی تین۔ ان دونوں نمازوں کے فرضوں کی تعداد میں کوئی قصر نہیں اور ان میں قصر نہ ہونے پر امت اسلامیہ کا اجماع ہے۔[1] کیونکہ صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ مکہ مکرمہ میں دو دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں۔ پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بحکم الٰہی) ہر دو رکعتوں کے ساتھ دو رکعتوں کا اضافہ فرمایا سوائے مغرب اور فجر کے، کیونکہ مغرب دن کی نمازِ وتر ہے اور فجر کی قراءت لمبی ہوتی ہے۔ البتہ سفر کے دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی طرح ہی نماز پڑھتے تھے۔[2]

اسی طرح بخاری اور ترمذی شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مغرب پہلے دن سے ہی تین رکعتیں تھیں اور سفر و حضر میں برابر تین رکعتیں ہی رہیں۔[3]

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سفر میں فجر کے دو فرض، ظہر و عصر کے بھی دو دو فرض، مغرب کے تین اور عشا کے بھی دو فرض ہوتے ہیں۔

قصر کا حکم :

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ سے مروی ہے کہ منیٰ میں ہمیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں (نماز قصر) پڑھائی، جبکہ ہم لوگ ہمیشہ کی نسبت تعداد کے لحاظ سے زیادہ اور انتہائی پُر امن بھی تھے۔[4]

سفر میں ہمیشہ قصر ہی سنتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہمیشہ نمازِ قصر پڑھا کرتے تھے۔

[1]المرعاة(3/ 39)تحقيق زاد المعاد(1/ 289،288)تحقيق مشكاة المصابيح(1/ 322)فتح الباري(3/ 99،98)نيل الأوطار(2/ 3/ 122،121)سنن أبي داؤد،رقم الحديث(358-360)سنن الترمذي(2/ 412-414) [2] حوالہ جات سابقہ۔ [3] صحيح البخاري مع الفتح(3/ 98،97) [4] المرعاة(3/ 39)المحلّى(2/ 4/ 170،169)

کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں کبھی چار رکعتیں بھی پڑھی ہوں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما منیٰ میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ کا عمل بھی ابتدائے خلافت (کے چھے یا آٹھ سال) یہی تھا۔[1]

جبکہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں انہی سے مروی ہے:

((صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَكَانَ لَا يَزِيْدُ فِي السَّفَرِ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ كَذٰلِكَ))[2]

"میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی ایسے ہی کیا کرتے تھے۔"

صحیح بخاری و مسلم میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے تلاوت کی:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ---﴾[الأحزاب:21]

"تمھارے لیے رسول اللہ کی ذاتِ گرامی میں بہترین نمونہ ہے۔۔۔۔"[3]

قصر۔۔۔واجب ہے یا جائز؟

اس سلسلے میں تو تمام ائمہ وفقہا کا اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں نمازِ قصر ہی پڑھی ہے۔ البتہ اس بارے میں ائمہ کرام بلکہ صحابہ ہی میں دو طرح کی رائے پائی جاتی تھی کہ آیا سفر میں قصر واجب ہے یا صرف جائز؟ اور دورانِ سفر پوری نماز پڑھنا افضل ہے یا قصر کرنا افضل ہے؟ اسی موضوع کی بعض احادیث کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم ائمہ تابعین میں سے حضرت عمر بن عبد العزیز، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ اور ائمہ وفقہائے احناف رحمہ اللہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سفر میں چار رکعتیں پڑھ لے اور وقت ہوتے ہوئے اسے حقیقت حال معلوم ہو جائے تو وہ نماز کا

[1]المحلى لابن حزم(2/ 4/ 170) [2] المحلى لابن حزم(2/ 4/ 167،166) [3] المغني لابن قدامة(2/ 32)

اعادہ کر لے اور قصر پڑھے۔ لیکن وجوبِ قصر کے وہ بھی قائل نہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عائشہ و عثمان اور ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک قصر واجب نہیں بلکہ محض رخصت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر اہل علم کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کا استدلال ایک تو سورۃ النساء کی آیت (101) سے ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاۃِ﴾

"اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کر لو۔" ان کے نزدیک حرج وجوب پر نہیں بلکہ رخصت پر دلالت کرتے ہیں۔ ایسے ہی صحیح مسلم والی حدیث سے بھی ان کا استدلال ہے:

((صَدَقَۃٌ تَصَدَّقَ اللّٰہُ بِہَا عَلَیْکُمْ))[1]

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "صدقہ" قرار دیا ہے۔ صدقے کے ظاہر سے قصر کا رخصت ہونا ہی معلوم ہوتا ہے نہ کہ واجب ہونا۔ ایسی ہی کئی دوسری دلیلیں بھی ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے طرفین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد وجوب کے راجح ہونے کے میلان کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ قصر ہی افضل ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر افضل کو ترک کر کے مفضول پر عمل کرتے رہے ہوں۔[2] جن روایات میں قصر کے بجائے تکمیل کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہیں۔[3]

یہ ایک خالص علمی نوعیت کی بحث ہے اور طرفین کے پاس دلائل بھی موجود ہیں۔ اب اسے واجب سمجھیں یا رخصت قرار دیں، کچھ بھی ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر میں ہمیشہ قصر پڑھا کرتے تھے، لہٰذا ہمیں بھی قصر ہی پڑھنی چاہیے کہ یہی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قصر نہیں کرتا تو اس کی نماز بھی درست ہے اور اعادے کی ضرورت نہیں۔[4]

[1]الفتح الرباني(5/ 54) [2] ضعيف الجامع الصغير(3/ 205)سلسلة الأحاديث الضعيفة(1/ 278) [3] صحيح البخاري(3/ 622)الفتح الرباني(5/ 58)مشكاة المصابيح(2/ 1143)رقم الحديث(3899)صحيح الجامع(3/ 222)

ہاں سفر کے دوران میں قصر کے بجائے پوری نماز پڑھنے والے اکثر لوگوں پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور افضل کو ترک کرتے ہیں، بلکہ خود اپنے امام مجتہد کی مخالفت بھی کر جاتے ہیں۔ جب تھوڑی مشقت پر زیادہ اجر مل رہا ہو تو پھر اپنے آپ کو زیادہ مشقت والے کام میں ڈالنے سے کیا حاصل؟ ویسے بھی صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰی رُخَصُہٗ کَمَا یَکْرَہُ اَنْ تُؤْتٰی مَعْصِیَتُہٗ))[1]

"اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی دی ہوئی رخصتوں کو اپنایا جائے، جیسا کہ وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔"

قصر کی مسافت:

نمازِ قصر کے لیے سفر کی وہ کم از کم مقدار کیا ہے جس میں قصر کی جائے؟ اس کی تعیین نہ تو سورۃ النساء کی آیت (101) سے ہوتی ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ---﴾ ''جب تم سفر پر نکلو۔۔۔''

۔احناف کا مسلک:

ایک قول کے مطابق احناف کا مسلک یہ ہے کہ تین مراحل (بہتّر میل) سے کم مسافت ہو تو

[1]مشكاة المصابيح(1/ 421)الفتح الرباني(5/ 94)المرعاة(3/ 259) [2] مشكاة المصابيح(3/ 271،270)الفتح الرباني(5/ 92)

قصر نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایات ملتی ہیں۔ البحر الرائق میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے قصر کی مسافت چوبیس فرسنگ منقول ہے۔ ایک فرسنگ تین میل کا ہوتا ہے۔ البحر الرائق ہی میں امام صاحب رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ وہ سفر پیدل یا اونٹ پر تین دنوں میں طے ہو۔ ان کا استدلال بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث سے ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ(مَسِيْرَةَ)ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ))

''کوئی عورت کسی محرم کے بغیر وہ سفر نہ کرے، جس کی مسافت تین دن میں طے ہو۔''

جمہور ائمہ کا مسلک:

باقی تینوں ائمہ اور فقہائے اصحاب الحدیث کے نزدیک قصر کی مسافت دو مرحلے یا اڑتالیس میل ہے۔ ان کا استدلال نسائی شریف کے سوا صحاحِ ستہ میں مذکور اس حدیث سے ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ لِاِمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا ذُوْمَحْرَمٍ))

''کسی عورت کے لیے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہو، یہ جائز نہیں کہ وہ ایک دن اور رات میں طے ہونے والا سفر کسی محرم کے بغیر کرے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن اور رات میں طے ہونے والی مسافت کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کہا ہے۔ اپنی اس بات کی تائید کے لیے بخاری شریف کے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ چار برید کی مسافت پر نماز میں قصر اور روزہ افطار کیا کرتے تھے اور چار برید کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ سولہ فرسنگ (اڑتالیس میل) ہوتے ہیں۔''[1]

علماء حدیث کا مسلک:

شارحِ مشکات علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوری نے اسی اڑتالیس (48) میل والے

[1]مشكاة المصابيح(1/ 421)الفتح الرباني(5/ 94)المرعاة(3/ 259) [2] مشكاة المصابيح(3/ 271،270)الفتح الرباني(5/ 92)

مسلک کو اختیار کیا ہے۔[1]

علماء ظاہریہ کا مسلک:

اس بارے میں ظاہریہ نے قصر کے لیے کم از کم مسافت تین میل کو اختیار کیا ہے۔ان کا استدلال بھی اسی مسلم و ابو داود اور مسند احمد والی حدیث سے ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سب سے زیادہ صحیح اور صریح قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں تین میل پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کرنا بھی مذکور ہے۔[3] اس کی تائید سنن سعید بن منصور میں مذکور اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ فرماتے ہیں:
((كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا سَافَرَ فَرْسَخًا يَقْصُرُ الصَّلَاةَ))[4]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک فرسخ (تین میل) سفر کرتے تو اس میں نماز قصر پڑھا کرتے تھے۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تلخیص الحبیر" میں یہ حدیث نقل کی ہے اور اس پر کوئی جرح و تنقید نہیں کی۔اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو پھر واضح ہو گیا کہ تین میل سے کم مسافت میں قصر جائز نہیں، لیکن بعض دیگر کبار محدثین نے اس کی سند پر کلام کیا ہے۔لہٰذا اس حدیث کا صحیح ہونا ثابت نہ ہوا۔[1]

کیفیتِ سفر:

یاد رہے کہ "الفقہ علی المذاہب الأربعۃ" کے مطابق اس چیز پر چاروں مذاہب کا اتفاق ہے کہ قصر کی یہ مسافت (پیدل یا اونٹ وغیرہ پر جانے کی وجہ سے) خواہ کئی دن میں طے ہو یا پھر (تیز رفتار ذرائع مواصلات بس، کار، ہوائی جہاز وغیرہ کی وجہ سے) جلد طے ہو، اس میں بہر حال قصر جائز ہے۔[6] کیونکہ جوازِ قصر کا باعث سفر و مسافت ہے نہ کہ وقت۔بعض لوگ آرام سے کہہ دیتے ہیں کہ آج تو سفر ہی انتہائی آسان ہو گئے ہیں، لہٰذا قصر کی کیا ضرورت ہے! ان کا یہ کہنا نہ صرف یہ کہ مزاجِ شریعت سے موافقت نہیں رکھتا، بلکہ مذاہب اربعہ کے مذکورہ اتفاق کے بھی خلاف ہے۔لہٰذا سفر میں قصر کی رخصت پر عمل کرنا چاہیے۔بعض ائمہ کے نزدیک تو قصر واجب ہے اور افضل بھی۔جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔

آغازِ قصر:

نماز قصر پڑھنے کا آغاز کہاں سے کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں بھی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعیین ثابت نہیں۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستی یا آبادی سے نکل جاتے تو قصر شروع فرما دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد، ابن ابی شیبہ اور بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعتیں پڑھیں۔[1]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سفر پر نکلنے سے پہلے ہی نماز قصر کی ہو۔ اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب اپنی بستی کے مکانوں سے باہر نکل جائے تو قصر شروع کرے۔ یہی جمہور علماء امت کا مسلک ہے۔[2] بعض جزوی امور سے قطع نظر ائمہ اربعہ کا بھی اس پر اتفاق ہے۔[3]

مدتِ قصر:

اب رہی یہ بات کہ ایک شخص سفر پر نکلے اور اسے چند دن راستہ طے کرتے لگ جائیں اور پھر جہاں پہنچے، وہاں اس کا کچھ مدت ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو دورانِ سفر تو وہ قصر ہی کرتا جائے گا، لیکن جب وہ کہیں جا کر ٹھہر جائے تو وہاں کب تک قصر پڑھی جا سکتی ہے اور کتنے دنوں سے زیادہ قیام کرنے کا ارادہ ہو تو پھر پوری نماز پڑھی جائے گی؟

[1]صحيح البخاري مع الفتح(2/ 565-569)

مدتِ قصر میں مختلف اقوال:

صحیح بخاری، مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں فتح مکہ کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انیس دن قیام کرنے اور قصر کرنے کی بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ کا مسلک یہ تھا کہ جب ہم انیس دن سفر میں رہیں گے تو قصر کریں گے اور اگر اس سے زیادہ کا خیال ہو گا تو نماز پوری پڑھیں گے۔ امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور اسے سب سے قوی قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمہم اللہ کا اپنا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، سنن نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں مذکور حجۃ الوداع والے واقعے کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ سے مدتِ قصر صرف دس دن منقول ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ اور ایک روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ سے پندرہ دن کی مدت بیان کی گئی ہے (جبکہ دوسری روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بارہ دن کی مدتِ قصر بھی منقول ہے) امام اوزاعی رحمہم اللہ بھی بارہ دن کی طرف گئے ہیں، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ محض اجتہاد ہے۔[1]

احناف کا مسلک بھی یہی ہے کہ جہاں آدمی پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کا ارادہ کر لے، وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا اور اس سے کم کا ارادہ ہو تو قصر کرے گا۔ جبکہ حضرت عثمان و انس رضی اللہ اور ایک روایت میں ابن عمر رضی اللہ سے چار روز مدتِ قصر کی روایت ملتی ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ انھوں نے بعض احادیث سے استدلال کیا ہے۔[2] علامہ عبید اللہ رحمانی نے المرعاۃ میں اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔[3]

مجبور کے لیے حکم:

مذکورہ مدتِ قصر تو اس مسافر کے لیے ہے، جس کا کسی شہر میں یا کسی جگہ پر جا کر ایک مقررہ مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو۔ اگر کسی جگہ مجبوراً رکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری زائل ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو ایسی جگہ بلا تعینِ مدت قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سلسلے میں متعدد آثار اور مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ مسند احمد، بیہقی، مصنف عبد الرزاق اور سنن اثرم میں صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم غزوات کے سلسلے میں آذربائی جان میں تھے کہ برف باری کی وجہ سے وہاں ہمیں چھے ماہ رکنا پڑا اور اس ساری مدت میں ہم دو رکعتیں (نمازِ قصر) پڑھتے رہے۔[5]

[1]فتح الباري(2/ 567)إرواء الغليل(3/ 17) [2] معالم السنن للخطابي(2/ 49)عون المعبود(4/ 68) [3] فتح الباري(2/ 567)نيل الأوطار(2/ 3/ 205)الفتح االرباني(5/ 103-104) [4] صلاة المسلمين(ص: 287) [5] الفقه الإسلامي و أدلته للزحيلي(2/ 321) [6] الفقه الإسلامي(1/ 473)

اسی طرح بیہقی میں ایک صحت و ضعف کے مابین مختلف فیہ روایت میں حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم رامہرمز میں نو ماہ مقیم رہے اور قصر کرتے رہے۔[1] امام زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ میں ان کے علاوہ بھی کئی آثار نقل کیے ہیں۔[2] امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ مسافر اگر اقامت کی نیت نہ رکھتا ہو (بلکہ مجبوراً رکا ہوا ہو) تو وہ قصر کرتا رہے گا، چاہے اس طرح اس کو کئی سال ہی کیوں نہ رکنا پڑے۔[3] حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اس بات پر اتفاق ہے۔ البتہ شافعیہ کا کہنا ہے کہ ایسی شکل میں بھی پہلے اٹھارہ دن سے زیادہ قصر نہیں کر سکتا۔[4] لیکن عملِ صحابہ رضی اللہ عنہم اس مسلک کے سراسر خلاف ہے۔

سفر میں سنن و نوافل:

وہ سفر جس میں نمازیں قصر کی جاتی ہیں، اس کے دوران میں عام سنتوں اور نوافل کے پڑھنے یا نہ پڑھنے کے سلسلے میں عام فہم سی بات تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض رکعتوں کی چار کے بجائے دو پڑھنے کی اجازت دے دی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل مبارک سے ایک نمونہ قائم فرما دیا ہے تو پھر وہاں سنتوں اور نوافل کی کیا ضرورت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ کسی صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سفر میں فرض نماز سے پہلے یا بعد میں نفل پڑھے ہوں، سوائے فجر کی سنتوں اور نمازِ وتر کے، یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر و حضر ہر موقع پر پڑھا کرتے تھے۔[1]

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، ابو داود، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث کے حوالے سے متعدد احادیث گزری ہیں، جن میں مذکور ہے کہ سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف دو دو رکعتیں ہی پڑھا کرتے تھے اور مغرب کی تین۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((صَحِبْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم فَلَمْ اَرَهُ يُسَبِّحُ فِي السَّفَرِ،وَقَالَ اللهُ جَلَّ ذِكْرُهُ:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾))[2]

"میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (سفر میں) رہا ہوں۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر میں (نمازوں کی) سنّتیں اور نوافل پڑھتے نہیں دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الاحزاب آیت: 21 میں) فرمایا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔" مسلم شریف میں تو بڑی وضاحت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ کے پوتے حضرت حفص بن عاصم بن عمر فرماتے ہیں کہ میں (اپنے چچا) عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مصاحبت میں سفر مکہ پر نکلا تو انھوں نے ہمیں ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں، پھر سب اُن کے مقامِ قیام (خیمہ وغیرہ) میں چلے گئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر ان کا دھیان اس جگہ کی طرف گیا، جہاں نماز پڑھی تھی تو دیکھا کہ کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ سنّتیں پڑھ رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ مُسَبِّحًا اَتْمَمْتُ صَلَاتِيْ يَا ابْنَ اَخِيْ،اِنِّيْ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فِي السَّفَرِ فَلَمْ يَزِدْ عَلَى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ،وَصَحِبْتُ اَبَا بَكْرٍ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ،وَصَحِبْتُ عُمَرَ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ،ثُمَّ صَحِبْتُ عُثْمَانَ فَلَمْ يَزِدْ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ))

[1]فتح الباري(2/ 565) [2] صحيح البخاري(2/ 561)الفتح الرباني(5/ 110) [3] صحيح البخاري مع الفتح(8/ 21)

"بھتیجے! اگر مجھے سنّتیں پڑھنا ہی ہوتیں تو پھر میں نماز کو پورا ہی کیوں نہ پڑھ لیتا؟ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح طاہر قبض کر لی گئی۔ میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ کے ساتھ بھی سفر کیے ہیں، وہ بھی دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روحِ عنصری قبض کر لی گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ کے ساتھ بھی سفر کیے ہیں، وہ بھی سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روح عنصری بھی قبض کر لی گئی، پھر میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ کے ساتھ بھی سفروں میں رہا ہوں، وہ بھی دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی روح عنصری قبض کر لی گئی۔" حضرت عثمان رضی اللہ کا اپنے عہد کے چھے یا آٹھ سال بعد نماز کو مکمل پڑھنا وارد ہوا ہے، اُس کی اس سے نفی نہیں ہوتی، بلکہ یہ اکثریت کی بنا پر ہے۔ یہ بھی مذکور ہے کہ جب ان سے ان کے مکمل نماز پڑھنے کا ذکر ہوا تو انھوں نے مذکورہ آیت: ﴿لَقَدْ كَانَ

لَكُمْ۔۔۔﴾ پڑھ دی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ ہوتے تو چار اور جب اکیلے ہوتے تو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔[1] اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔۔۔﴾[الأحزاب:21][2]

"تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین نمونہ ہیں۔۔۔"

عام نفل نمازیں:

امام نووی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ اور بعض دیگر اہل

[1]فتح الباري(2/ 62-561)الفتح الرباني(5/ 111)نيل الأوطار(2/ 3/ 210) [2] نيل الأوطار أيضاً. [3] الفتح الرباني(5/ 111)نيل الأوطار(2/ 3/ 209) [4] نيل الأوطار أيضًا و إرواء الغليل(3/ 23)

علم سفر کے دوران میں سنتیں پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ ان سنتوں سے مراد صرف نماز کے پہلے اور بعد والی موکدہ سنتیں ہیں۔ البتہ عام نفلی نماز اس سے الگ ہے۔ خود ابن عمر رضی اللہ بھی عام نوافل پڑھا کرتے تھے۔ یہ عام نوافل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے:

((إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم كَانَ يُسَبِّحُ عَلَى ظَهْرِ رَاحِلَتِهِ حَيْثُ كَانَ وَجْهُهُ يُوْمِئُ بِرَأْسِهِ))

"نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر نوافل پڑھتے تھے، سواری چاہے جس رُخ پر بھی جا رہی ہوتی، اور اپنے سر اَقدس کے اشارے سے (رکوع و سجود) کرتے تھے۔"

اسی حدیث کے آخر میں مذکور ہے کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل تھا۔[1] صحیح بخاری و مسلم شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دورانِ سفر وتر پڑھنا بھی ثابت ہے۔[2] اسی طرح صحیح بخاری شریف میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دورانِ سفر فجر کی سنتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔[3] صحیح بخاری شریف ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ضحیٰ یا اشراق یعنی چاشت کی آٹھ رکعتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر میں غسل فرمایا اور آٹھ رکعتیں پڑھیں، جو انتہائی تخفیف سے ادا فرمائیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجود پوری طرح ادا کر رہے تھے۔[4] جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، بیہقی اور مسند احمد کی بعض احادیث سے دورانِ سفر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور بعد میں دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ موطا امام مالک اور مسند احمد کی بعض روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران سفر تہجد ادا کرنے کا بھی ذکر ہے۔[5]

ان مختلف قسم کی احادیث کے مجموعی مفاد سے شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ جمع و تطبیق ذکر کی ہے کہ دورانِ سفر چار قسم کے نوافل و سنن کی اجازت ہے۔ پہلی وہ سنّتیں جو فرضوں کے بعد والی موکدہ سنّتیں ہیں، دوسری وہ جن کا ایک وقت مخصوص ہوتا ہے، جیسے نمازِ ضحیٰ، تیسری صلاۃ اللیل یعنی

[1]تحفة الأحوذي(3/ 114) [2] سنن الترمذي و تحفة الأحوذي(3/ 110-114)شرح السنة(4/ 81-175)نيل الأوطار(2/ 3/ 210) [3] المرعاة(3/ 256) [4] نيل الأوطار(2/ 3/ 211)زاد المعاد(1/ 464)المحلى لابن حزم(ص: 24-28)سبل السلام(1/ 2/ 41) [5] إرواء الغليل(3/ 27-28)تحفة الأحوذي(3/ 115)نيل الأوطار(2/ 3/ 209)

تہجد اور چوتھی مطلق نفلی نمازیں ہیں۔[1] شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی موکدہ سنتوں کی نفی (غالب احوال کے بارے میں ہے) اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً یہ سنّتیں اپنے گھر میں ادا کرتے ہوں گے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں پاتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیانِ جواز کے لیے چھوڑ دیتے ہوں گے۔[2]

الغرض اس مسئلے میں وسعت ہے۔ اگر کوئی شخص صرف مغرب کے تین اور باقی نمازوں کے دو دو فرائض ہی پڑھتا جائے اور فجر کی سنّتیں اور نمازِ وتر ادا کر لے تو کافی ہے، اور اگر کوئی شخص سنتیں اور دوسرے نوافل پڑھ لے تو بھی کوئی حرج نہیں۔[3]

جمع صوری:

بعض اہل علم نے جمع بین الصلاتین کو "جمع حقیقی" نہیں بلکہ "جمع صوری" قرار دیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی نماز کو اس کے آخری وقت تک موخر اور دوسری کو اوّل وقت تک مقدم کر کے پڑھا، تاکہ ہر دو نمازیں ہی اپنے وقت پر ہوں۔

سفر حج میں جمع کرنا:

عام سفروں کے علاوہ خاص سفر حج میں بھی قصر و جمع اسی طرح ثابت ہے، مگر حجاج کی کثیر تعداد اس رعایت سے مستفید نہیں ہوتی۔ میدانِ عرفات و مزدلفہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع و قصر سے ظہر و عصر اور مغرب و عشا ادا فرمائیں، ظہر و عصر کو ظہر کے وقت اور مغرب و عشا کو عشا کے وقت پڑھا تھا۔ اس کے سنّت ہونے میں تمام ائمہ و فقہا کا اتفاق ہے۔[5] کیونکہ صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت جابر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ دو نمازیں پڑھیں اور مزدلفہ آئے تو وہاں مغرب و عشا بھی ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمائیں اور دو نمازوں کے مابین کوئی سنن و نوافل نہیں پڑھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے، یہاں تک کہ فجر طلوع ہوئی۔[1] صحیح بخاری شریف، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ نبیِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب و عشا کو جمع کر کے دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمایا اور ان کے مابین کوئی سنن و نوافل نہیں پڑھے اور نہ کسی کے بعد میں نوافل ادا فرمائے۔[2]

صلاۃ الخوف

خوف کی حالت میں جو نماز ادا کی جاتی ہے، وہ ''صلاۃ الخوف'' کہلاتی ہے۔ مسلمان چونکہ ایک مجاہد قوم ہے، اس کے افراد کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر جہاد کی ضرورت پڑ سکتی ہے، دشمنانِ دین اور اعدائے اسلام سے کسی بھی موقع پر مڈ بھیڑ ہو سکتی ہے، لہٰذا اسلامی سلطنت کی حفاظت کے لیے محاذوں پر برسرِ پیکار افواج اور دوسرے کسی بھی خوف و خطر کی حالت میں نماز ادا کرنے کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث شریفہ میں بتادیا ہے۔ خطرات کی مختلف حالتوں میں نماز ادا کرنے کے بھی مختلف انداز سکھائے گئے ہیں، تاکہ جو انداز جہاں مناسب ہو، اس پر عمل کر لیا جائے۔

''صلاۃ الخوف'' کی مختلف انواع و اشکال اور طریقے:

اہل علم نے اس سلسلے میں وارد ہونے والی متعدد احادیث کی بنا پر صلاۃ الخوف کی مختلف انواع ذکر کی ہیں۔ چنانچہ ابن القصار مالکی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مختلف مقامات پر صلاۃ الخوف پڑھی۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کی کل سولہ شکلیں ہیں اور ہر شکل ہی جائز ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کی مختلف انواع ہیں، جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ایام میں مختلف طریقوں سے ادا فرمایا۔ جو نماز کے لیے زیادہ قرین احتیاط اور دشمن سے حفاظت کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ اس کی شکلیں مختلف ہونے کے باوجود ان میں معنوی طور پر اتفاق و اتحاد پایا جاتا ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے آٹھ انداز ذکر کیے ہیں اور امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے ان میں ایک اور کا اضافہ کر کے نو ذکر فرمائے ہیں۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلّٰی'' میں نمازِ خوف کی چودہ شکلوں کا ذکر کر کے پھر چند ایک درج کی ہیں اور اس موضوع پر اپنے ایک مستقل رسالے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صلاۃ الخوف کے مختلف طریقے ظاہر کرنے والی سولہ احادیث ہیں۔ البتہ علامہ عراقی رحمہ اللہ نے شرح ترمذی میں ان سولہ احادیث کو ذکر کرنے کے ساتھ

[1]صحيح البخاري مع الفتح(2/ 579) [2] صحيح البخاري(2/ 579-581)صحيح مسلم(3/ 5/ 212-213) [3] صحيح البخاري مع الفتح(2/ 581)

ایک اور روایت کا اضافہ بھی کیا ہے، جس سے ان کی تعداد سترہ ہو گئی ہے۔ امام ابن العربی نے یہ بھی لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوبیس مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ان تمام احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے جو تجزیہ کیا ہے اس کا نتیجہ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''اہل علم نے صلاۃ الخوف کے بارے میں مروی احادیث میں اختلافِ روات کو دیکھ کر ہر واقعے کی کئی شکلیں بیان کر دی ہیں، جو مجموعی طور پر سترہ تک جا پہنچی ہیں، لیکن درحقیقت نمازِ خوف کے اصولی و بنیادی طور پر صرف چھے ہی مختلف طریقے ہیں۔'' حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اس تجزیہ کو ''معتمد'' قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی چھے اور سات کا عدد ہی منقول ہے۔[1]

بنیادی طریقہ:

سب سے پہلا بنیادی طریقہ تو خود قرآن کریم میں مذکور ہے۔ یہ طریقہ ان حالات کے لیے ہے، جب دشمن کے حملے کا خطرہ تو موجود ہو، مگر جنگ جاری نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾[النساء:102]

"اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے

[1]فتح الباري(2/ 583) [2] فتح الباري(2/ 583) [3] فتح الباري(2/ 580) [4] الفتح الرباني(5/ 119) [5] الفتح الرباني(5/ 139)

اسلحہ لیے رہیں، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، وہ آکر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہیں۔ یہ اس لیے کہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں، البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔" اگلی ہی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾[النساء:103]

"پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پھر (پوری اور بر وقت) نماز پڑھو، بے شک نماز ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔"

ایک وضاحت:

کتبِ حدیث و فقہ میں اس کے مختلف حالات کے مطابق متعدد انداز مذکور ہیں، جو بہ قول علامہ ابن قیم رحمہ اللہ و امام احمد رحمہ اللہ صرف چھے اصولی طریقوں میں منحصر ہیں۔ پھر ان چھے طریقوں میں سے بھی بعض اُن حالات کے لیے ہیں، جب دشمن قبلہ کی طرف نہیں بلکہ کسی اور جانب ہو۔ دیگر بعض طریقے ایسی صورت کے لیے قابلِ عمل ہیں، جب خوف یا دشمن عین جہت قبلہ پر ہو۔ اختصار کے پیش نظر نصوصِ حدیث کا ذکر کیے بغیر صرف اُن کے مفہوم کو آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں، جس سے سب طریقے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

پہلا طریقہ:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر دشمن قبلے کی جہت میں نہ ہو تو فوج یا مبتلاے خوف لوگوں کے دو گروہ ہو جائیں۔ ایک گروہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہے اور دوسرا امام کے ساتھ نماز شروع کر دے۔ جب یہ ایک رکعت مکمل کر لیں تو امام خاموشی سے کھڑا رہے اور مقتدی خود ہی دوسری رکعت پڑھیں اور سلام پھیر کر دشمن کے مقابلے میں جا کھڑے ہوں۔ تب دوسرا گروہ آجائے اور وہ امام کی دوسری رکعت میں شامل ہو جائے۔ اب امام اپنی دوسری رکعت کا قیام و قراءت اور رکوع و سجود مکمل کر کے تشہد کی حالت میں خاموشی سے بیٹھ جائے، لیکن یہ لوگ اٹھ کر اپنی دوسری رکعت مکمل کر لیں، پھر امام کے ساتھ تشہد و دعا پڑھیں اور امام کے ساتھ ہی سلام پھیر لیں۔ یہ طریقہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک، سنن بیہقی اور مسند احمد میں مذکور ہے اور اس حدیث میں صراحت ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھائی تھی۔[1]

دوسرا طریقہ:

دشمن کے قبلے کی جانب نہ ہونے کی شکل میں صلاۃ الخوف کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، پھر ان میں سے ایک حصہ دشمن کے مقابلے میں رہے اور دوسرے حصے کو امام ایک رکعت پڑھائے۔ ایک رکعت مکمل کر کے یہ حصہ دشمن کے مقابلے میں چلا جائے اور دوسرا حصہ آکر امام کی دوسری رکعت کے ساتھ نماز شروع کر لے۔ فوج کے دونوں حصے ہی ایک ایک رکعت کی قضا کریں۔ یہ طریقہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، موطا امام مالک، مسند احمد اور سنن بیہقی میں مذکور ہے کہ غزوۂ اہل نجد کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھائی۔[2] علامہ عینی و قسطلانی نے اسے غزوۂ ذات الرقاع لکھا ہے۔[3]

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا گروہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہیں کھڑا ہو کر دوسری رکعت کی قضا کرے اور سلام پھیر کر دشمن کے مقابلے میں چلا جائے۔ نمازیوں کا پہلا حصہ، دوسرے حصے کے وہاں کھڑے ہو جانے کے بعد دوسری رکعت کی قضا آکر کرے۔ اسی طریقے کے راجح ہونے کا ثبوت سنن ابو داود میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ سے مروی حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نمازیوں کے دوسرے حصے کی نماز تو مسلسل ہو گی اور ان کے بعد پہلے حصے کے نمازی اپنی نماز مکمل کریں گے۔[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی ہنگامی اور جنگی حالت میں دو رکعت کے مابین کچھ چل لینا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ پہلے حصے کے نمازیوں سے ہوا۔

تیسرا طریقہ:

صلاۃ الخوف ادا کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام نمازیوں کے دو حصے کر کے ان میں سے ہر حصے کو دو دو رکعتیں پڑھائے۔ جب پہلا حصہ دو رکعتیں پڑھ کر امام کے ساتھ سلام پھیر لے اور دشمن کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو تو دوسرا حصہ آجائے اور وہ بھی پہلے حصے کی طرح ہی امام کے ساتھ دو مصلی رکعتیں پڑھے اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار رکعتیں ہو جائیں گی (پہلی دو فرض اور دوسری دو نفل، اور مفترض کی نماز نفل کے پیچھے جائز ہے جس کی تفصیل امامت کے مسائل میں ذکر ہوئی ہے) اور دوسری نمازیوں کی دو دو رکعتیں ہی ہوں گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح نمازِ خوف پڑھانا صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم اور دارمی میں مذکور ہے۔[2]

چوتھا طریقہ:

دشمن قبلے کی جانب ہو تو اس موقع پر صلاۃ الخوف ادا کرنے کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے دو گروہ بن جائیں اور دونوں ہی امام کی اقتدا میں نماز شروع کر لیں۔ قیام و رکوع وغیرہ تمام ارکان میں وہ دونوں گروہ ہی امام کے ساتھ ساتھ رہیں اور دشمن کی طرف سے بے خبر بھی نہ ہوں،

[1]فقہ السنۃ(1/ 291)جواز الجمع للمریض،رواہ البخاری معلقا و عبدالرزاق موصولا۔البخاري مع فتح الباري(2/ 41،40) [2] مشکاۃ المصابیح(1/ 625)إرواء الغلیل(1/ 202)و(3/ 38)

لیکن جب امام سجدہ ریز ہو تو اس وقت آگے والے گروہ (مثلاً چھے صفیں ہونے کی شکل میں آگے والی تین صفوں) کے نمازی تو امام کے ساتھ ہی سجدے میں چلے جائیں، لیکن پیچھے والے گروہ یا پچھلی تین صفوں کے نمازی قومے کی حالت ہی میں رہیں۔ جب آگے والے سجدے سے فارغ ہو جائیں تو پھر پیچھے والے سجدہ کر لیں اور پہلی رکعت مکمل ہونے کے بعد آگے والے پیچھے اور پیچھے والے آگے ہو جائیں، پھر پہلی رکعت کی طرح ہی دوسری رکعت بھی مکمل کریں اور پھر اکٹھے ہی تشہد و دعا کے بعد امام کے ساتھ سلام پھیر لیں۔ یہ طریقہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ خوف پڑھنے والے ایک صحابی حضرت جابر رضی اللہ نے اور سنن ابو داود، نسائی و مسند احمد میں ابی عیاش زرقی رضی اللہ نے نقل فرمایا ہے۔[1]

اس حدیث میں ایک رکعت کے بعد آگے والوں کے پیچھے آجانے اور پیچھے والوں کے آگے بڑھ جانے کا ذکر ہے، لہٰذا یہ بھی جائز ہے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مروی ایک حدیث کے ظاہر سے آگے اور پیچھے والے سب نمازیوں کا اپنی اپنی جگہ پر ہی دونوں رکعتیں پڑھنا معلوم ہوتا ہے، جگہ بدلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ لہٰذا دونوں طریقوں میں سے جسے بھی اختیار کر لیا جائے جائز اور ثابت ہے۔[2]

پانچواں طریقہ:

صلاۃ الخوف ادا کرنے کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کے دو حصے ہو جائیں اور دونوں ہی تکبیر تحریمہ کے وقت امام کے ساتھ مل جائیں، اگرچہ ایک حصے کا منہ قبلہ جہت کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایک حصّہ تو دشمن کے سامنے ڈٹا رہے اور ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل پڑھ لے، پھر یہ دشمن کے مقابل جا کھڑے ہوں اور وہ آجائیں، جبکہ امام اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہے گا، حتیٰ کہ دوسرا حصہ آکر پہلے اپنے طور پر ایک رکعت نہ پڑھ لے۔ جب وہ ایک رکعت پڑھ چکیں تو امام دوسری رکعت شروع کر دے گا اور جب اس دوسرے حصے والوں کے ساتھ امام دوسری رکعت کے سجود سے فارغ ہو جائے تو تشہد کی حالت میں خاموشی سے سب بیٹھ جائیں گے اور نمازیوں کا وہ پہلا حصہ آجائے گا جو ایک رکعت پڑھ کر چلا گیا تھا، اب وہ اپنے طور پر دوسری رکعت کے قیام ورکوع اور قومہ و سجود سے فارغ ہوں گے۔ اس کے بعد امام اور نمازیوں کے دونوں حصے مل کر تشہد و دعا سے فارغ ہوں گے اور اکٹھے ہی سلام پھیریں گے۔ اس طرح امام کی بھی دو رکعتیں ہوں گی اور مقتدیوں کی بھی، نماز کا آغاز بھی سب مل کر کریں گے اور سلام بھی اکٹھے ہی پھیریں گے۔ یہ طریقہ سنن ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں مذکور ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ نجد کے سال خود میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ خوف (اسی طرح) پڑھی۔[1]

چھٹا طریقہ:

چھٹا طریقہ یہ ہے کہ نمازیوں کے دو گروہ بن جائیں اور ہر گروہ باری باری امام کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت پڑھ کر ہی سلام پھیرتا جائے اور اسی ایک رکعت پر ہی کفایت کرے، دوسری رکعت ساتھ نہ ملائے۔ اس طرح امام کی تو دو رکعتیں ہو جائیں گی، لیکن نمازیوں کی صرف ایک ایک رکعت ہی مکمل نماز ہوگی۔ یہ طریقہ ابو داود، نسائی اور صحیح ابن حبان میں مذکور ہے۔ سنن نسائی و ابن حبان میں ہے کہ ذی قرد کے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھائی۔ سنن ابو داود و نسائی کی دوسری روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ الخوف کے حوالے سے قبرستان میں حضرت حذیفہ رضی اللہ کا اسی طرح نماز پڑھانا مذکور ہے۔ سنن نسائی کی ایک تیسری روایت میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ الخوف کا یہ بھی طریقہ منقول ہے۔[2] جبکہ سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں ضجنان و عسفان کے مابین بھی اسی طرح نمازِ خوف پڑھانا وارد ہوا ہے۔[3]

ایک اشکال اور اس کا ازالہ:

اب رہا یہ اشکال کہ مقتدیوں کی اس صورت میں صرف ایک رکعت ہی کیسے کافی ہو گی اور صلاۃ الخوف کا کبھی صرف ایک رکعت ہی ہونا کہاں ثابت ہے؟ جن کتبِ حدیث کے حوالے سے ہم نے یہ چھٹا طریقہ ذکر کیا ہے، ان میں "وَلَمْ يَقْضُوا رَكْعَةً" کے الفاظ بھی مذکور ہیں کہ ایک ایک رکعت پڑھنے والوں نے بعد میں دوسری رکعت نہیں پڑھی، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خوف کی حالت میں صرف اتنی نماز بھی جائز ہے۔ بعض اہل علم نے اسے شدید خوف کے ساتھ مقید کیا ہے۔[1]

صلاۃ الخوف کا صرف ایک ہی رکعت ہونا صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((فَرَضَ اللهُ الصَّلاَةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ صلى الله عليه وسلم فِي الْحَضَرِ اَرْبَعًا،وَفِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ،وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً))[2]

"اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے تم پر قیام کی حالت میں چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔"
امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری، ضحاک اور امام اسحاق بن راہویہ، ایسے ہی علماء سلف کی ایک جماعت نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے ایک رکعت ہی کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ امام مالک و شافعی اور جمہور کا کہنا ہے کہ صرف ایک رکعت جائز نہیں۔ اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد امام کے ساتھ ایک رکعت ہے اور دوسری رکعت وہ خود پڑھے گا۔[3]

علامہ سندھی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک رکعت کے واجب ہونے اور دو پر عمل کرنے میں کوئی منافات نہیں کہ اس تاویل کی ضرورت پڑتی۔[5]

خوف میں نمازِ مغرب ادا کرنے کے طریقے:

نماز مغرب کی سفر و حضر ہر موقع پر ہی تین رکعتیں فرض ہیں، ان میں قصر نہیں کی جاسکتی۔ صلاۃ الخوف ادا کرنے کے جتنے بھی طریقے آپ کے سامنے رکھے جا چکے ہیں ان سب میں یا تو دو رکعتوں والی نمازوں کا ذکر ہوا ہے، جو مغرب کے سوا باقی چاروں نمازیں ہیں، یا پھر شدید خوف کی شکل میں مقتدیوں کے صرف ایک ایک رکعت پر اکتفا کا ذکر ہے، مگر اس میں بھی امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں۔ اب مسئلہ ہے نمازِ مغرب کو صلاۃ الخوف کی شکل میں ادا کرنے کا، اس کی تین رکعتیں ہونے کی وجہ سے مقتدیوں کے دو حصّے کیے جائیں تو وہ برابر برابر جماعت نہیں پا سکتے، کیونکہ تین رکعتوں کا نصف کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا یقینی بات ہے کہ مجاہدین کے دو حصوں میں سے ایک حصہ تو امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے گا اور دوسرا حصہ ایک رکعت۔ ائمہ و فقہا میں سے بعض نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ پہلے حصے کو امام دو رکعتیں پڑھائے اور دوسرے کو ایک۔ بعض دیگر کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ پہلے حصے کو ایک رکعت پڑھائے اور دوسرے کو دو۔ لیکن اس کا طریقہ کیا ہو؟

پہلاطریقہ:

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کے بارے میں جتنی احادیث مروی ہیں،ان میں نمازِ مغرب کا طریقہ مذکور نہیں۔[1] موصوف کی اس نفی سے غالباًان کی مراد یہ ہے کہ نمازِ مغرب کی خوف کے موقع پر صرف تین رکعتیں ادا کرنے کی کیفیت بتانے والی کوئی صحیح وصریح اور قطعی غیر متکلم فیہ حدیث نہیں،ورنہ سنن دار قطنی، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ سے مروی ایک روایت میں نمازِ مغرب ادا کرنے کا طریقہ بھی مذکور ہے اور وہ یوں کہ مقتدیوں کے دو حصے ہو جائیں۔امام پہلے حصے کو پوری نماز تین رکعتیں پڑھا کر سلام پھیرے تو وہ چلے جائیں اور دوسرے آجائیں،پھر انھیں بھی تین رکعتیں ہی پڑھائے۔مذکورہ کتب میں یہ طریقہ بھی خود نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار فرمودہ ہے۔اس طرح مقتدیوں کی تین تین اور امام کی چھے رکعتیں ہو جائیں گی۔[2]

[1]فتح الباري(2/ 431)سنن أبي داؤد(4/ 120) [2] صحيح البخاري،صحيح مسلم(3/ 6/ 129-130)سنن أبي داؤد(4/ 126-129)نيل الأوطار(2/ 3/ 319)مشكاة المصابيح(3/ 324-426)شرح السنة للبغوي(4/ 283)

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اس روایت کو بخاری ومسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور ''تلخیص المستدرک'' میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے امام حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔[1]

اس روایت کی سند میں ایک راوی عمرو بن خلیفہ بکراوی ہیں، جنھیں امام ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ان سے روایت لی ہے،البتہ اسماء الرجال کی معروف کتاب ''لسان المیزان'' میں ان کی روایات میں سے بعض پر ''منکر'' ہونے کا شبہہ ظاہر کیا گیا ہے۔[2]

سنن ابو داود میں صلاۃ الخوف کا وہ طریقہ جس میں امام کی چار اور مقتدیوں کے دونوں حصوں کی دو دو رکعتیں ہوتی ہیں،اس طریقے پر مبنی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ سے مروی مرفوع حدیث ذکر کرنے کے بعد صاحبِ سنن امام ابو داود لکھتے ہیں کہ اسی طرح مغرب کی نماز بھی ہے کہ امام کی چھے رکعتیں ہو جائیں گی اور مقتدیوں کی تین تین۔[3] یعنی آدھے لوگ پہلے پوری نماز امام کے ساتھ پڑھ لیں گے اور آدھے بعد میں۔سنن ابو داود کی شرح ''عون المعبود'' میں لکھا ہے کہ یہ امام ابو داود کا قول ہے،جبکہ بیہقی میں اسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی لکھتے ہیں کہ امام کی چھے اور مقتدیوں کی تین تین رکعتوں والا قول میرے خیال میں ایک راوی حضرت اشعث رحمہ اللہ کا ہے۔امام بیہقی نے اپنی کتاب ''معرفۃ السنن والآثار'' میں بھی اسی بات کو صحیح تر قرار دیا ہے۔[4]

امام ابو داود کے مذکورہ الفاظ کہ امام کی چھ اور مقتدیوں کی تین تین رکعتیں ہو جائیں گی،یہ نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ صحیح قیاس ہے۔[5]

دوسرا طریقہ:

اب رہا مجاہدین کے دو حصے کر کے ایک حصے کو دو رکعتیں اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھانے کا معاملہ، تو اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بہ قول کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی۔

اس بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کے وجود کی نفی کی ہے، البتہ سنن بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ کے بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے خوف کی حالت میں نمازِ مغرب پڑھائی تھی اور انھوں نے پہلے گروہ کو ایک رکعت اور دوسرے کو دو رکعتیں پڑھائی تھیں، جبکہ البحر الرائق میں اس کے برعکس مذکور ہے کہ انھوں نے پہلے گروہ کو دو اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھائی تھی۔ الغرض احناف اور مالکیہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے کہ پہلے گروہ کو دو رکعتیں اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھائے، جبکہ امام شافعی و احمد رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ سے مروی راجح تر روایت کے مطابق اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ پہلے کو ایک رکعت اور دوسرے کو دو رکعتیں پڑھائے۔[1]

ان ہر دو طریقوں کے مطابق جس گروہ کی جتنی نماز امام کے بغیر ہو گی، اس کو ادا کرنے کی شکل حضرت سہل رضی اللہ سے مروی صلاۃ الخوف کے پہلے طریقے میں گزر چکی ہے۔[2]

ان سب طریقوں سے نماز کو بروقت ادا کرنے اور جماعت کی اہمیت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

گھمسان کی جنگ اور دست بدست لڑائی میں نماز؟

گھمسان کی جنگ اور دست بدست لڑائی کی شکل میں اگر نماز باجماعت ممکن نہ ہو تو سورۃ البقرہ کی آیت (239) میں ارشادِ الٰہی اور صحیح بخاری و مسلم میں مذکور احادیث کی رو سے پیدل یا سوار، قبلہ رو ہو کر یا جدھر بھی منہ ہو، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ہی نماز پڑھ لے، رکوع و سجود کے لیے صرف اشارے سے کام لے اور رکوع کی نسبت سجدے کے لیے اشارہ کرتے وقت کچھ زیادہ جھکے۔[3]

تعاقب کرنے والے اور تعاقب کیے جانے والے کی نماز:

''صلاة الطالب والمطلوب راكعًا وإيمائً'' صحیح بخاری شریف کے ایک باب کا عنوان ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب سے واپس لوٹے تو ہمیں حکم فرمایا:

((لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ))[1]

''تم سب لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ بنی قریظہ کی بستی میں جا کر نماز پڑھو۔'' اب بعض لوگوں کو راستے ہی میں نماز عصر کا وقت ہو گیا تو ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم تو بنی قریظہ تک پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے کہا کہ پڑھ لیتے ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سے ایسا کوئی

ارادہ یا مطالبہ نہیں تھا۔ پھر بعد میں یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں سے کسی پر سختی نہیں فرمائی۔[2]

اوقاتِ قبولیت، آدابِ دعا اور شرائطِ قبولیت

اوقات قبولیت:

سلام پھیرنے کے بعد مسنون اذکار اور دعاؤں کا موقع آتا ہے۔ یوں تو اللہ ربّ العزت ہر وقت اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے، ان کی فریادیں سنتا ہے اور اُس کا درِ رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾[البقرۃ:168]

"(اے میرے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (انھیں بتا دیں کہ) میں بہت قریب ہوں، میں پکارنے والوں کی دعا سنتا (اور قبول کرتا) ہوں وہ جب بھی مجھے پکاریں، پس انھیں بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تاکہ وہ رشد و ہدایت پائیں۔"

سورۃ الغافر (آیت:60) میں ارشاد فرمایا:

﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ "مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔"

سورۃ الاعراف (آیت:55) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً﴾

"لوگو! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے سے پکارو۔" ا

ِن ارشاداتِ الٰہیہ سے معلوم ہوا کہ اللہ اَحکم الحاکمین کا دروازہ اپنے بندوں کے لیے ہر وقت کھلا ہے۔ کوئی جب بھی اسے پکارے، وہ سنتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر یہ بھی فضل و احسان کر رکھا ہے کہ اپنی عبادات و مناجات کے لیے بعض اوقات کو خاص کر دیا ہے، جن میں دعائیں بہت

[1]المرعاة(3/ 326) [2] أيضًا(ص: 327) [3] سنن أبي داؤد مع العون(4/ 127) [4] بحواله عون المعبود(4/ 127) [5] نيل الأوطار(2/ 3/ 320)

جلد قبول ہوتی ہیں۔ ان اوقاتِ مخصوصہ کی پوری تفصیل تو کتبِ حدیث اور خصوصاً کتب ادعیہ واذکار میں بڑی مرتب و منظم شکل میں مذکور ہے۔[1] ہم یہاں موقع کی مناسبت سے ان اوقاتِ مخصوصہ میں سے صرف ایک وقت کا ذکر کر رہے ہیں، جو فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

((اَيُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ؟))

"(اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!) کون سی دعا سب سے زیادہ اور جلد قبول ہوتی ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((جَوْفَ اللَّيْلِ الْآخِرِ وَ دُبُرَ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوْبَاتِ))[2]

"رات کے آخری حصے کی دعاے سحر گاہی اور فرض نماز کے بعد کی دعائیں (بہت زیادہ اور جلد قبول ہوتی ہیں)۔'

' آداب و شرائطِ قبولیت:

یاد رہے کہ جس طرح قبولیتِ دعا کے لیے بعض اوقات مخصوص ہیں، اسی طرح قبولیتِ دعا کے لیے بعض شرطیں بھی ہیں، جن کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ قبولیتِ دعا کے آداب و شرائط کا ذکر بھی قدرے طویل ہے۔[3] البتہ ان میں سے بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ بہ وقتِ دعا آدمی کو اخلاص للہ اور ایمان باللہ کا پیکر ہونا چاہیے، کیونکہ سورۃ البقرہ (آیت:186)، سورت حج (آیت:37)، سورۃ الغافر (آیت:55 اور 56) اور سورۃ البینہ (آیت:5) میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی ہے۔ نیز آدمی کو دعا مانگتے وقت اس کی قبولیت کا پختہ یقین رکھ کر دعا کرنا چاہیے اور دل کی گہرائی سے دعا مانگنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ترمذی شریف اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے:

((اُدْعُوا اللهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ،وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً ا مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لاَهٍ))[1]

[1]فقه السنة(1/ 281)نيل الأوطار(2/ 3/ 322)المغني لابن قدامة(2/ 339-340) [2] للتفصيل: المغني(2/ 341-342) [3] صحيح البخاري(2/ 431)و(8/ 199)صحيح مسلم(3/ 6/ 125)نيل الأوطار(2/ 3/ 323)

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور دعا کرتے وقت اس کی قبولیت کا یقین کامل رکھو اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔" اس سے معلوم ہوا کہ اجابتِ دعا کے لیے حضورِ قلب اور اخلاصِ کامل نہایت ضروری ہیں، ورنہ اگر زبان سے دعا کرتے رہیں اور دل اِدھر اُدھر کے خیالات میں بھٹک رہا ہو تو وہ دعا کیا قبول ہوگی اور اُس نماز سے کیا حاصل ہوگا۔ بقول شاعر: ع

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زباں در ذکر، دل در ذکر خانہ چہ حاصل زیں نمازِ پنجگانہ

دعاؤں اور اذکار کا وقت:

فرض نمازوں سے سلام پھیرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار دعائیں اور اذکار ثابت ہیں، جن میں سے حسبِ موقع اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ ضرور پڑھنے کے بعد ہی سنن و نوافل کا آغاز کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اکیلے ہوں یا جماعت کے ساتھ، فرض نماز کا سلام پھیرتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بقیہ سنتیں یا نوافل پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جلد بازی خلافِ سنت ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرض نماز کے بعد والے اذکار اور دعائیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "بہتر یہ ہے کہ نوافل سے پہلے ان وظیفوں کو پڑھ لیا کریں، کیونکہ بعض وظائف کا قبل از نوافل پڑھنا نص حدیث سے ثابت ہے۔" آگے وہ نصوص بھی نقل کی ہیں۔[2]

صحاحِ ستہ کی کتاب سنن ابو داود میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز کی جماعت کرائی اور نمازیوں کی پہلی صف میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ ایک نمازی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے فوراً بعد اٹھ کر نمازِ نفل پڑھنا چاہی:

((فَوَثَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ،فَاَخَذ بِمَنْكِبَيْهِ فَهَزَّهُ،ثُمَّ قَالَ:اِجْلِسْ،فَاِنَّهُ لَمْ يُهْلَكْ اَهْلُ الْكِتَابِ اِلَّا اَنَّهُمْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ صَلَوَاتِهِمْ فَصْلٌ))

[1]صحيح البخاري مع الفتح(2/ 436) [2] للتفصيل: فتح الباري شرح صحيح البخاري(2/ 436-438)نيل الأوطار(2/ 3/ 324)فقہ السنۃ(1/ 282)

"حضرت عمر رضی اللہ اس کی طرف جھپٹے اور اس کے کندھوں کو پکڑ کر ہلایا اور پھر فرمایا: بیٹھ جاؤ، اہل کتاب کی ہلاکت کا سبب یہی تھا کہ ان کی (فرض و نفل) نمازوں کے مابین وقفہ اور فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔" یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہِ مبارک اٹھائی اور (حضرت عمر رضی اللہ کے تجزیہ کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہوئے فرمایا:

((اَصَابَ اللهُ بِكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ))[1]

"اے خطاب کے بیٹے عمر! اللہ تجھے خطا سے بچاتا رہے۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضوں کے فوراً بعد سنتیں یا نفل پڑھنا شروع کر دینا کس قدر نامناسب بلکہ مہلک ہے۔ فرض و نفل کے مابین واضح فرق اور فاصلہ کرنے کے لیے ہی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((اِجْعَلُوْ هَا فِیْ بُیُوْتِکُمْ))''ان (سنتوں اور نوافل) کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔''

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنتوں اور نفلوں کو اپنے گھروں میں پڑھنے میں سارا بھید یہ ہے کہ فرائض اور سنن و نوافل میں کسی ایسی چیز سے فصل ہو جائے جو ان دونوں کی جنس سے نہ ہو، اور پھر وہ فصل بھی قابل اعتبار ہو جو بہ ظاہر معلوم بھی ہو سکے۔[2]

جو شخص کسی وجہ سے سنتیں اور نوافل گھر جا کر نہ پڑھ سکتا ہو، اس کے لیے فرض و نفل کے مابین اذکار و وظائف کا کچھ دیر پڑھ لینا بھی وقفہ بن جاتا ہے، لہٰذا اس طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔

دعائیں اور اذکار:

فرض نمازوں کے بعد والے اذکار و وظائف تو بے شمار ہیں،[3] جن میں سے چند صحیح اسناد سے مروی اذکار و وظائف ہم آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

1 اس سلسلے میں سب سے پہلے جس وظیفہ یا دعا کا ذکر آتا ہے، وہ ہے تکبیر، یعنی اللہ اکبر کہنا۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابو داود و نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((کُنْتُ اَعْرِفُ اِنْقِضَاءَ صَلَاۃِ رَسُوْلِ اللهِ صلی الله علیہ وسلم بِالتَّکْبِیْرِ))[1]

''میں اللہ اکبر کی آواز سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مکمل ہونے کا پتا لگاتا تھا۔'' صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کیا کرتے تھے۔[2] لہٰذا فرض نمازوں کا سلام پھیرتے ہی تمام نمازیوں کو بیک زبان، بآوازِ بلند اللہ اکبر کہنا چاہیے۔ مگر افسوس کہ آج اکثر لوگ اس سنّت سے غافل ہیں۔

2 اللہ اکبر کے بعد تین مرتبہ((اَسْتَغْفِرُ اللهَ)) کہنا اور پھر((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ)) کہنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم، بلکہ بخاری شریف کے سوا صحاح ستہ کی تمام کتب اور دارمی و ابن خزیمہ میں حضرت ثوبان رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ ''اَستغفر اللہ'' کہتے اور پھر یہ دعا پڑھتے:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ))[3]

''اے اللہ! تو ہمہ سلامتی ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ملتی ہے۔ تو ذاتِ بابرکات اور صاحب جلال و اکرام ہے۔'' کتبِ حدیث میں تو یہ دعا صرف اتنی ہی ہے، لیکن اس میں جو: ''وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ السَّلَامُ،فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ'' (اور تیری ہی طرف سلام لوٹ جاتا ہے، ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور ہمیں دارالسلام میں داخل کر) کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے، ان کی کوئی اصل نہیں۔ بلکہ ''تصحیح المصابیح'' میں

شیخ جزری رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ یہ الفاظ من گھڑت ہیں۔[4] لہٰذا صرف انہی الفاظ پر اکتفا کرنا چاہیے، جو صحیح مسلم وغیرہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

البتہ رؤیتِ کعبہ کی دعا میں صرف ''فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ'' کے الفاظ ثابت ہیں اور وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ سے نہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ جیسا کہ سنن بیہقی(5/ 72)اور مصنف ابن ابی شیبہ(4/ 97)کے حوالے سے شیخ البانی نے ''مناسک الحج والعمرۃ''(ص:19)میں نقل کیے ہیں۔ بقیہ الفاظ اُس وقت کے لیے بھی ثابت نہیں۔ سلام پھیرنے کے بعد ان الفاظ کا اضافہ تو بہ قول شیخ جزری من گھڑت میں ہے۔ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھلائی ہوئی اصلی دعا میں ان ''بناسبتی'' الفاظ کی آمیزش نہیں کرنا چاہیے۔ 3 فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد والے وظائف واذکار میں سے صحیح مسلم، سنن ابو داود و نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ،لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ،لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ،لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ،وَلَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَائُ الْحَسَنُ،لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ))[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریفیں اسی کے لیے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نیکی کرنے کی توفیق اور برائی سے بچنے کی ہمت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور ہم صرف اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ ہر قسم کی نعمتیں اور فضل اُسی کی طرف سے ہے اور ہر عمدہ ثنا بھی اُسی کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ ہم یہ بات اس کے دین کو اس کے لیے خالص کر کے کہتے ہیں، چاہے کافروں کو یہ بات اچھی نہ بھی لگے۔'' کتاب الأم للشافعی(1/ 110)اور مشکوٰۃ شریف میں یُھَلِّلُ بِصَوْتِہِ الأعلٰی'' کے الفاظ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ مشکوٰۃ میں کتاب الأم والی روایت ہی فصل اوّل میں درج ہو گئی ہے۔[2]

4 صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، نسائی، دارمی اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ،لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ،اَللّٰہُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ))[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جسے تو دے اس سے کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے تو روک لے اسے کوئی دے نہیں سکتا اور اس کے مقابلے میں کسی طاقت و دولت والے کے اس کی طاقت و دولت کسی کام نہیں آسکتی۔'' نسائی شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا تین مرتبہ پڑھا کرتے تھے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ طبرانی میں ((لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ)) کے بعد ((یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَہُوَ حَیٌّ لاَ یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ)) کے الفاظ بھی ثقہ روات سے مروی ہیں۔[3]

5 سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ کو وصیت فرمائی تھی کہ یہ دعا کسی نماز کے بعد پڑھنا نہ بھولنا: ((اَللّٰہُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ))[4]

"اے اللہ! مجھے اپنا ذکر و شکر کرنے میں اور اپنی حسنِ عبادت میں تو ہی میری مدد فرما۔"

6 آیۃ الکرسی:

فرض نمازوں کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کی بھی بڑی فضیلت ہے۔ چنانچہ نسائی (سنن کبریٰ یا "عمل الیوم واللیلۃ") صحیح ابن حبان اور "عمل الیوم واللیلۃ" لابن السنی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[1] قبولیتِ دعا کی شرائط و آداب، اوقات و مقامات، مستجاب الدعوات وغیرہ امور کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: "مسنون ذکر الٰہی" (ص 15، تا 85) یاد رہے کہ اس کتاب میں قرآن و سنت سے ثابت شدہ (423) دعائیں و اذکار بھی جمع ہیں اور اب اس کا یہ حصہ "آدابِ دعا" کے نام سے بھی مطبوع ہے۔ وللہ الحمد ولہ المنّۃ۔ [2] مشکاۃ المصابیح (1/ 305) [3] دیکھیں: (ص: 51)

"جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اسے موت کے علاوہ کوئی چیز جنت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی۔" نص حدیث "المرعاۃ" (2/ 573) میں مذکور ہے۔ یعنی اِدھر آنکھیں بند ہوئیں، اُدھر وہ جنت میں پہنچ گیا۔ یہ آیت الکرسی قرآن کریم کے تیسرے پارے کے شروع میں سورۃ البقرہ کی آیت (255) ہے۔ لہٰذا اُسے وہاں سے یاد کر کے ہر فرض نماز کے بعد ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ شعب الایمان بیہقی کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت کے جزو ثانی میں ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور اُس کے پڑوسیوں کے گھروں کو (چوری وغیرہ سے) پُر امن کر دیتا ہے۔ لیکن اس روایت کو خود امام بیہقی نے اور پھر امام ابن الجوزی، امام سیوطی اور بعض دیگر کبار محدثین نے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

7 تسبیح:

فرض نمازوں کے بعد والے اذکار و وظائف میں سے "سُبْحَانَ اللہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اللہُ اَکْبَرُ" کی تسبیح تو معروف ہے۔ اس کے سات مختلف طریقے احادیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا معروف طریقہ:

(33)مرتبہ ''سُبْحَانَ اللهِ''(33)مرتبہ ''اَلْحَمْدُ لِلهِ'' اور(34)مرتبہ ''اَللهُ اَكْبَر '' والا ہے،جوترمذی شریف میں ہے۔لیکن ہمارے یہاں کے مروّج طریقے میں ایک کمی پائی جاتی ہے اوروہ ہے دس مرتبہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ'' کانہ پڑھنا۔کیونکہ ترمذی شریف میں اس کا بھی ذکر ہے۔[2] یہ روایت سنن نسائی میں بھی ہے، مگراس میں اللہ اکبر(33)مرتبہ مذکور ہے،البتہ دس مرتبہ ''لَااِلٰہَ اِلّا اللّٰہ'' اس میں بھی منقول ہے۔[3]

اس تسبیح کی فضیلت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غریب لوگ آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم !مال دار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں،جو ہم بھی کرتے ہیں،لیکن یہ لوگ مال دار ہونے کی وجہ سے غلام آزاد کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات دیتے ہیں،ہم ان نیکیوں

[1]سنن الترمذي(9/ 450)وفي التحفة شاہد لہ،رواہ أحمد. [2] حجة الله البالغة،مترجم اردو،(ص: 364)

سے محروم رہ جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر یہ تسبیح کرلیا کرو:

((فَاِنَّكُمْ تُدْرِكُوْنَ بِهٖ مَنْ سَبَقَكُمْ وَلَا يَسْبِقُكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ))[1]

''تو اس سے تم ان لوگوں سے آگے نکل جاؤگے جو تم سے پہلے آئے ہیں اور وہ لوگ بھی تم سے آگے نہیں نکل سکیں گے جو تمھارے بعد آئیں گے۔''

دوسرا طریقہ:

یہ بعینہٖ ہمارے یہاں معروف اور مروّج ہے اور وہ یہ ہے:(33)مرتبہ سبحان الله،(33)مرتبہ الحمدلله اور(34)مرتبہ الله اکبر کہنا۔چنانچہ صحیح مسلم، سنن ترمذی اور نسائی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيْبُ قَائِلُهُنَّ اَوْ فَاعِلُهُنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ))[2]

''یہ چند کلمات ہیں جنھیں ہر فرض نماز کے بعد کہنے والا کبھی محروم نہیں رہے گا۔''

تیسرا طریقہ:

یہ ہے کہ ان تینوں کلمات کو صرف 33،33 مرتبہ کہا جائے۔ صحیح بخاری و مسلم میں مذکور اس طریقے کی فضیلت بھی وہی ہے جو غریبوں کو مال دار لوگوں کے مقابلے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے طریقے کی حدیث میں بتائی ہے۔البتہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ غریب مہاجرین

لوٹ کر پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ یہی تسبیح ہمارے مال دار بھائی بھی کرنے لگے (اس طرح وہ پھر ہم سب سے آگے نکل جائیں گے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((ذٰلِکَ فَضْلُ اللهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآئُ))[3]

''اب یہ تو اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔''

چوتھا طریقہ:

یہ ہے کہ ان تینوں کلمات کو تو 33، 33 مرتبہ ہی کہا جائے، جس کا مجموعہ ننانوے (99) ہو

[1] الفتح الرباني (4/ 31) سنن أبي داوٗد (1/ 385) مشكاة المصابيح (1/ 7-306) [2] حجة الله البالغة أيضًا۔ [3] ان دعاؤں اور اذکار کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''مسنون ذکر الٰہی'' جس کی طرف اشارہ گزرا ہے۔

جائے گا اور سو پورا کرنے کے لیے یہ کہے:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ))[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریف اس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سنن ابو داود، نسائی، بیہقی، دارمی، موطا امام مالک اور صحیح ابن خزیمہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((غُفِرَتْ خَطَایَاهُ وَاِنْ کَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ))

''اس کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔'

'پانچواں طریقہ:

سنن نسائی، دارمی، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان اور مسند احمد میں یہ مذکور ہے کہ (25) مرتبہ سبحان اللہ، (25) مرتبہ الحمدللہ، (25) مرتبہ اللہ اکبر اور (25) مرتبہ ہی ((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ)) کہیں۔[2]

چھٹا طریقہ:

صحیح مسلم (سابقہ حوالہ) میں بہت مختصر ہے کہ ان تینوں کلمات کو صرف گیارہ گیارہ مرتبہ ہی کہہ لے۔

ساتواں طریقہ:

یہ اور بھی مختصر ہے کہ کم از کم ان تینوں کلمات کو صرف دس دس مرتبہ ہی کہہ لے۔ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ یہ (پنج گانہ نمازوں کے بعد کہنے سے) زبان پر تو کل ایک سو پچاس کلمے بنیں گے، لیکن میزانِ حسنات میں یہ ایک ہزار پانچ سو شمار ہوں گے۔[3] واللہ ولي التوفيق۔

[1]مشكاة المصابيح(1/ 303)و المرعاة(2/ 555) [2] حاشية مشكاة المصابيح أيضًا۔ [3] مشكاة المصابيح أيضًا و المرعاة(2/ 556) [4] تحفة الأحوذي(2/ 193)حاشية مشكاة المصابيح(1/ 303)و المرعاة(2/ 555)

دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر تسبیح وغیرہ:

وِرد یا وظیفہ کرتے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی گنتی اپنے دست مبارک کی انگلیوں کے پوروں پر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی شریف اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((رَأَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یَعْقِدُ التَّسْبِیْحَ بِیَدِہٖ))[1]

"میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ (کی انگلیوں) پر تسبیح کر رہے تھے۔"

اس حدیث شریف میں تو مطلق ہاتھ کا ذکر آیا ہے، وہ دایاں ہاتھ تھا یا بایاں؟ اس کی وضاحت نہیں، جبکہ سنن ابو داود و ترمذی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں انہی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ایک صحیح سند والی حدیث کے الفاظ ہیں:

((رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَعْقِدُ التَّسْبِیْحَ بِیَمِیْنِہٖ))[2]

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں ہاتھ (کی انگلیوں) پر تسبیح کر رہے تھے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دائیں ہاتھ پر ہی تسبیح کرنا چاہیے۔ اگرچہ پہلی مطلق حدیث کے پیش نظر اہل علم دونوں ہاتھوں پر ہی تسبیح کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن کبار علما نے اس دوسری حدیث کی بنا پر صرف دائیں ہاتھ پر تسبیح کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔ لہٰذا کوشش کرنا چاہیے کہ صرف دائیں ہاتھ پر تسبیح کرنے کی عادت ہو جائے، تاکہ مفت میں فضیلت حاصل ہوتی رہے۔ ویسے بھی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر معاملے میں دایاں پہلو ہی پسند تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند پوری امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اندازہ کرنا ہو تو زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ اور تعلیم فرمودہ روشن مثالیں موجود ہیں۔

1۔ مثلاً کھانے پینے کے آداب سکھلاتے ہوئے صحیح مسلم میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

[1]مشكاة المصابيح(1/ 304)والمرعاة(2/ 558) [2] المرعاة(2/ 558)

((اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَاْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَاِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ))

"جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پینا چاہے تو دائیں ہاتھ سے پیے۔" اس حدیث کے آخر میں فرمایا:

((فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَاْكُلُ بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهٖ))[1]

"کیوں کہ بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا پیتا ہے۔" ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بچپن میں پل رہا تھا اور بچہ ہی تھا۔ کھانا کھاتے وقت میرا ہاتھ پلیٹ میں اِدھر اُدھر گردش کر رہا تھا تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا:

((سَمِّ اللهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ))[2]

"بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔"

2۔ صحیح مسلم میں جوتا پہننے کے آداب سکھلاتے ہوئے فرمایا:

((اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِيْنِ وَاِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ))

"جب تم میں سے کوئی شخص جوتا پہننا چاہے تو پہلے دائیں پاؤں سے شروع کرلے اور جب اُتارنے لگے تو پہلے بایاں جوتا اُتارے۔" 3۔ سنن ابو داود و ترمذی اور موطا امام مالک میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

((وَلْتَكُنِ الْيُمْنٰى اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ))[3]

"جوتا پہننے میں دائیں پاؤں کو اوّلیت دینی چاہیے اور اتارتے وقت دائیں پاؤں کو آخر میں ہونا چاہیے۔" بلوغ المرام میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایسے ہی لکھا ہے کہ یہ الفاظ سنن ابو داود و ترمذی اور موطا امام مالک میں ہیں اور امیر یمانی نے سبل السلام میں اسے ہی برقرار رکھا ہے۔ جبکہ مشکوٰۃ شریف

[1]مشكاة المصابيح(1/ 304)و المرعاة(2/ 557) [2] المرعاة(2/ 557) [3] المرعاة(ص: 556) [4] الفتح الرباني(4/ 55،54)

میں اس حدیث کے مذکورہ تمام الفاظ "باب النعال" کی فصل اوّل میں نقل کیے گئے ہیں اور آخر میں "متفق علیہ" بھی مذکور ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث پوری کی پوری بخاری و مسلم کی متفق علیہ ہے۔ ایسے ہی چند لوگوں کی مجلس میں کھانا اور مشروبات تقسیم کرنے کے آداب میں بھی دائیں جانب والوں کو اوّلیت دینا مسنون ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اَنس رضی اللہ سے مروی ہے کہ میں نے بکری کا دودھ دوہا اور پیالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمالیا تو حضرت عمر رضی اللہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ کو دیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلِ تیامن پر عمل فرماتے ہوئے اپنی دائیں جانب بیٹھے ایک عام اعرابی کو دودھ کا پیالہ پکڑا دیا اور ساتھ ہی اصول کو دہراتے ہوئے فرمایا:

((اَلْاَيْمَنَ فَالْاَيْمَنَ))پہلے دایاں، پھر اس کا دایاں۔" بخاری و مسلم کی ہی دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْاَيْمَنُوْنَ،اَلْاَيْمَنُوْنَ،اَلَا فَيَمِّنُوْا))[1] "دائیں جانب والے، پھر اُن کی دائیں جانب والے۔ خبر دار! دائیں پہلو کو اوّلیت دیا کرو۔" 4۔ ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں دوسرا واقعہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پینے کے بعد دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب ایک بچہ بیٹھا ہے اور بائیں جانب قوم کے بزرگ لوگ بیٹھے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((يَا غُلَامُ!اَتَاْذَنُ اَنْ اُعْطِيَهُ الْاَشْيَاخَ؟))

"برخوردار! کیا تم اجازت دیتے ہو کہ یہ پیالہ میں ان بزرگوں کو دے دوں؟" تو اس بچے نے کہا:

((مَا كُنْتُ لِاُوْثِرَ بِفَضْلٍ مِّنْكَ اَحَدًا يَا رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم!))

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے ہوئے مشروب سے پینے کا شرف اپنے

[1]هامش المشكاة(1/ 308)والمرعاة(2/ 73) [2] سنن الترمذي،ما جاء في التسبيح إدبار الصلاة(2/ 455) [3] سنن الترمذي(1/ 159 في الافتتاح)

سے پہلے میں کسی دوسرے کو نہیں دینا چاہتا۔"

((فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ))[1]

"تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ اسی ننھے منے صحابی کو بہ رضا و رغبت دے دیا۔"

5۔ سنن ترمذی شریف میں روایت ہے:

((كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم اِذَا لَبِسَ قَمِيْصًا بَدَأَ بِمَيَامِنِهٖ))[2]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قمیص پہننے لگتے تو پہلے دائیں (آستین سے) پہنتے تھے۔" 6۔ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے:

((إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم لَبِسَ خَاتَمَ فِضَّةٍ فِيْ يَمِيْنِهٖ))[3]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ (کی انگلی) میں پہنی۔"

7۔ سنن ابو داود و ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اِذَا لَبِسْتُمْ وَاِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَئُ وْا بِاَيَامِنِكُمْ))[4]

"جب تم کپڑا پہنو یا وضو کرو تو اپنے دائیں اعضا سے شروع کرو۔

" 8۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِيْ شَأْنِهٖ كُلِّهٖ فِيْ طُهُوْرِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَتَنَعُّلِهٖ))[5]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرنے، کنگھا کرنے، جوتا پہننے، بلکہ اپنے تمام امور میں حتیٰ المقدور دائیں پہلو کو پسند فرماتے تھے۔"

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام و مصافحہ دائیں ہاتھ سے کرتے تھے۔ مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حجامت بنوائی تو پہلے سر کے دائیں حصے کے بال

[1]سنن الترمذي(1/ 159 في الافتتاح) [2] مشكاة المصابيح(1/ 305)المرعاة(2/ 563)سنن الترمذي(9/ 385) [3] مشكاة المصابيح(1/ 304،305)

کٹوائے۔ سونے کے لیے لیٹتے تو دائیں ہتھیلی پر دایاں رخسار رکھ کر دائیں پہلو پر لیٹتے تھے۔ المختصر جس کام میں بھی عز و شرف کا پہلو ہے، اس کا آغاز دائیں سے فرماتے۔ البتہ مسجد سے نکلتے وقت بائیں قدم کو باہر رکھتے، حمام میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اندر رکھتے، ناک صاف کرنا اور استجمار و استنجا کرنا ہو تا تو بائیں ہاتھ سے کرتے۔

کبھی ہم اس کی مکمل تفصیل بھی ذکر دیں گے۔ ان شاء اللہ۔ بخاری شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ سے مروی حدیث سے (جو طریقۂ تعلیم پر دال ہے) جو مغالطہ دیا جاتا ہے، اس کی وضاحت بھی کر دی جائے گی۔ وبید اللہ التوفیق۔ ان تمام امور کے مجموعی مفہوم سے منشائے نبوت اور مزاجِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد کوئی وظیفہ یا تسبیح کرنا ہو تو اس کی گنتی ناک صاف کرنے اور استنجا کرنے والے بائیں ہاتھ پر نہیں، بلکہ صرف کھانے پینے اور سلام و مصافحہ کرنے والے دائیں ہاتھ پر کرنا چاہیے۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے بھی یہی افضل ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا کسی بھی دوسرے وقت جب چند گھڑیاں ذکر الٰہی میں گزارنے کا ارادہ ہو اور کوئی ورد یا وظیفہ کرنا ہو تو اس اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپناتے ہوئے دائیں ہاتھ پر گنتی کرنی چاہیے، کیونکہ اس کی گنتی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ پر اور خصوصاً دائیں ہاتھ پر کیا کرتے تھے، لہٰذا یہی مسنون و افضل ہے۔

[1]صحيح مسلم في المساجد،باب استحباب الذكر بعد الصلاة،رقم الحديث(597)مشكاة المصابيح(1/ 305)المرعاة(2/ 546) [2] الفتح الرباني(4/ 59)مشكاة المصابيح(1/ 307) [3] سنن الترمذي مع التحفة(9/ 355-356-357)

تسبیح کا استعمال؟

اب رہی یہ بات کہ اذکار و وظائف کی گنتی کے لیے جو "تسبیح" استعمال کی جاتی ہے، اس کا استعمال کیسا ہے؟ عہد نبوت، دورِ صحابہ اور قرونِ اولیٰ میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کسی صحیح[1] حدیث میں ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسبیح کا استعمال فرمایا ہو، بلکہ ہمیشہ اپنی انگلیوں کے پوروں پر تسبیح کرتے رہے اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ قیامت کے دن جب زبان پر مہر لگا دی جائے گی اور جسم کے دوسرے اعضا ہی بول بول کر انسان کے اچھے اور برے اعمال کی گواہی دیں گے تو اُس وقت انگلیوں کے پورے بھی گواہ بن جائیں گے۔ لہٰذا اس طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو فرمایا کہ "تسبیح و تہلیل اور تقدیس و توحید کا بیان لازم پکڑو۔" آخر میں فرمایا:

((وَاعْقِدْنَ بِالْأَنَامِلِ فَإِنَّهُنَّ مَسْؤُلَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ))

"یہ تسبیحات اپنے پوروں پر کرو، کیونکہ انگلیوں کے یہ پورے سوال کیے جائیں گے تو انھیں بولنے کی طاقت دی جائے گی تو یہ بول کر گواہی دیں گے۔" یہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنن ابو داود و ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں مذکور ہے۔ اسے امام حاکم اور امام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے اور امام نووی و ابن حجر نے اس کی تحسین کی ہے۔[2]

البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کے بارے میں ایسی روایات ملتی ہیں، جنھیں مروّجہ تسبیح کی نظیر قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ترمذی شریف میں اُمّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے جبکہ میرے سامنے کھجور کی چار ہزار گٹھلیاں رکھی تھیں، جن پر میں تسبیح کر رہی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان پر تم تسبیح کر چکی ہو۔ کیا میں تمھیں ایسا وظیفہ نہ بتاؤں جس کا ثواب تمھاری اس ساری تسبیح سے بھی زیادہ ہے؟" پھر وظیفے کے جو الفاظ بتائے وہ یہ تھے:

[1]سنن الترمذي مع التحفة(9/ 59-458) [2] السلسلة الضعيفة(1/ 112)

((سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ))[1]

"اللہ کی اتنی تسبیحات کہ جتنی اس کی مخلوقات کی تعداد ہے۔" ایسے ہی سنن ابو داود و ترمذی میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں وہ کسی عورت کے پاس گئے جس کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی تھیں، جن پر وہ تسبیح کر رہی تھیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تجھے ایسا وظیفہ نہ بتاؤں جو اس سب کچھ سے آسان یا افضل ہے۔ تب یہ وظیفہ بتایا:

((سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ---الخ))[2]

"پاک ہے اللہ، اس کی اتنی تسبیحات جتنی تعداد میں اس نے مخلوقات بنائیں۔" ان دونوں روایات کی بنا پر علامہ عبد الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے تسبیح کی موجودہ شکل کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تو صرف اس تسبیح کے موضوع پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام انھوں نے "المِنحۃ فی السّبحۃ" رکھا ہے اور اس میں انھوں نے کئی آثار بھی نقل کیے ہیں،[3] جن سے تسبیح کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

مسند الفردوس دیلمی میں ایک مرفوع روایت ہے:

((نِعْمَ الْمُذَكِّرُ السُّبْحَةُ))[4] "یاد دلانے والی بہترین چیز تسبیح ہے۔"

اس روایت سے بھی جواز پر استدلال کیا گیا ہے، لیکن تسبیح کے استعمال کے جواز پر دلالت کرنے والی ان تینوں روایات پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے اور بعض نقادانِ فن حدیث نے انھیں ضعیف اور اس آخری روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ ان نقادوں اور محدثین کرم میں سے امام دار قطنی، ابن عساکر، خطیب بغدادی، امام ذہبی، امام ترمذی، ابن معین، ابن عدی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان روایات کے ضعف کے ساتھ ساتھ بعض آثار ایسے بھی ہیں، جن سے ان روایات کے

[1]بلوغ المرام مع السبل(2/ 4/ 159)مشكاة المصابيح(2/ 1210) [2] مشكاة المصابيح(2/ 1210) [3] مشكاة المصابيح(157)

برعکس مفہوم ملتا ہے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما معروف صحابی رسول ہیں، ان کا گزر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو (دھاگے کی گرہوں پر بنی) تسبیح پر وظیفہ کر رہی تھیں تو انھوں نے اسے توڑ کر پھینک دیا۔ پھر ایک مرد کے پاس سے گزرے جو پتھر کی کنکریوں سے تسبیح کر رہے تھے تو انھیں اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کچھ سخت الفاظ بھی کہے۔ ایسے ہی معروف فقیہ حضرت امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ (2/ 89/ 2) میں مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو دھاگے کی تسبیحات بنانے والی عورتوں کے ساتھ تعاون کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔[1] شیخ ابن باز کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ "تسبیح" کا استعمال ثابت نہیں۔[2]

ان سب تفصیلات کے پیش نظر افضل اور بہتر یہی ہے کہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر ہی ذکر و اذکار اور وِرد و وظائف کیے جائیں۔ اس علمی بحث میں الجھنے سے قطع نظر، ہمارے ان (سعودی و خلیجی) ممالک میں تسبیح کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جارہا ہے کہ بازار میں چل رہے ہیں تو تسبیح ہاتھ میں اور باتیں کر رہے ہیں تو تسبیح کے دانے بھی مشینی انداز سے مسلسل گر رہے ہیں۔ خوب صورت سے خوبصورت رنگ کی تسبیح کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور لکڑ، پتھر یا پلاسٹک سے گزر کر خالص چاندی کی تسبیح بنوائی جارہی ہے اور پھر اسے احباب کی مجلس میں بڑے انوکھے انداز میں ہاتھ کی انگشتِ شہادت پر چڑھا کر گھمایا جاتا ہے اور تسبیح کو تسبیح کرنے کی بجائے شو پیس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اس مشقِ ستم، فخر و مباہات اور ریاکاری کے ان تمام مظاہر کو سامنے رکھا جائے تو اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ احیاے سنت کے لیے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر اذکار و وظائف کیے جائیں۔ یوں اخلاص میں صدق و گہرائی پیدا ہو گی اور فخر و ریا کے سائے سے بھی محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

کچھ اور اَذکار:

نمازِ پنج گانہ کے فرضوں کا سلام پھیرنے کے بعد جو مجموعی نوعیت کے اذکار و وظائف ہیں، ان

[1]مشكاة المصابيح(2/ 1231)

میں سے چند اذکار پیش کیے جاچکے ہیں، جبکہ بعض اذکار و وظائف اور دعائیں ایسی بھی ہیں جو نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے ساتھ خاص ہیں۔ نمازِ عصر سمیت ان دونوں نمازوں کے بعد ذکر و اذکار کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

10۔ جیسا کہ سنن ابو داود میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ فجر کی نماز کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک میرا ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہنا جو ذکر الٰہی میں مصروف ہوں، یہ عمل میرے نزدیک چار اسماعیلی غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے اور نمازِ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک میرا ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہنا جو ذکرِ باری تعالیٰ میں مشغول ہوں، یہ بات میرے نزدیک چار غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ محبوب ہے۔[1]

11۔ ایسے ہی ترمذی شریف میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جس شخص نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی، پھر طلوعِ آفتاب تک بیٹھا ذکر الٰہی میں مشغول رہا (اور سورج کے پوری طرح طلوع ہو جانے کے بعد) پھر دو رکعتیں ادا کیں:

((كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ))"اسے ایک (نفلی) حج و عمرہ کا ثواب ملے گا۔" پھر تین مرتبہ فرمایا:"پورے حج و عمرہ، پورے حج و عمرہ، پورے حج و عمرہ کا ثواب ملے گا!" [2]

12۔ فجر و مغرب کے ساتھ مخصوص اذکار میں سے ایک ذکر مسند احمد میں مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص نمازِ فجر و مغرب کے بعد اپنی جاے نماز سے اٹھنے سے پہلے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے دس مرتبہ یہ دعا پڑھے:

((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ،لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ،بِیَدِہِ الْخَیْرُ،یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ))

"اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ یکتا و تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام بادشاہی اور ہر قسم کی تعریف اُسی کے لیے ہے، بھلائی اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ زندہ کرنے اور مارنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

[1]مشكاة المصابيح(1232) [2] مشكاة المصابيح(2/ 1243) [3] مشكاة المصابيح(1254) [4] مشكاة المصابيح(1/ 127) [5] مشكاة المصابيح(1/ 127)

تو ہر مرتبہ (یہ دعا کرنے کے عوض) دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دس گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ کلمات اس کے لیے ہر برائی اور شیطان لعین کے وسوسے سے اسے محفوظ کر دیتے ہیں اور شرک کے سوا کوئی گناہ اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ اس شخص سے بڑھ کر عمل والا دوسرا کوئی شخص نہیں ہو گا، سوائے اس شخص کے جو اس سے بھی زیادہ کہے گا۔[1]

ترمذی شریف میں دعا تو یہی ہے، صرف دو لفظ بِیَدِہِ الْخَیْرُ" نہیں ہیں۔ اسے مغرب کے بعد دس مرتبہ پڑھنے کا ثواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ اس شخص کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ مسلح فرشتوں کو بھیجتا ہے، جو اس کو صبح ہونے تک شیطان سے محفوظ رکھتے ہیں، اس کے نامۂ اعمال میں (جنت) کو واجب کر دینے والی دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور ہلاکت خیز دس گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور اسے دس مومن غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔[2]

صحیح مسلم، سنن ترمذی، نسائی، مسند احمد و صحیح ابن حبان میں یہی کلمہ مگر بِیَدِہِ الْخَیْرُ" کی طرح "یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ" کے بھی بغیر ہے، جسے فجر کے بعد دس مرتبہ پڑھنے کا ثواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اس سے دس برائیاں مٹائی جاتی ہیں، اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور اس کو چار غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے اور یہ کلمات اس کے لیے شام تک شیطان سے حفاظت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ جب شام کو بھی (نمازِ مغرب کے بعد) یہ دعا پڑھ لے تو (نمازِ فجر تک) اسی طرح ثواب ملتا (اور حفاظت ہوتی) ہے۔ ایک روایت میں دس غلام آزاد کرنے کا ثواب مذکور ہے۔[3]

13۔ سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو شخص نمازِ مغرب کا سلام پھیر کر کسی سے بات کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ دعا کرے:

((اَللّٰہُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ))"اے اللہ! مجھے نارِ جہنم سے بچالے۔"

پھر اتفاق سے اسی رات اس کی وفات ہو جائے تو وہ (جہنم کی) آگ سے خلاصی پا جائے

[1]تحفة الأحوذي(7/ 513 تا 523)

گا۔اور پھر صبح کی نمازِ فجر کے بعد بھی اسی طرح کہے اور اس دن اس کی موت واقع ہو جائے تو بھی آگ سے نجات پا جائے گا۔[1]

14۔ بخاری شریف کے سوا صحاح ستہ کی پانچوں کتبِ حدیث اور مسند احمد و صحیح ابن خزیمہ میں ایک چھوٹی سی دعا ہے، جو انسان کو بہت سارے اذکار و وظائف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ایسے کاروباری یا مصروف لوگ جو زیادہ دیر بیٹھ کر وظائف میں مشغول نہیں رہ سکتے، انھیں تین مرتبہ یہ دعا ضرور پڑھ لینی چاہیے، کیونکہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر کے بعد میرے گھر سے ہو کر کہیں باہر تشریف لے گئے اور چاشت کے وقت تشریف لائے (جبکہ کافی سورج چڑھ آیا تھا) اور میں اپنی جائے نماز پر ہی بیٹھی (ذکر کر رہی) تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا جب سے میں گیا ہوں، اس وقت سے تم اسی طرح بیٹھی مشغولِ ذکر ہو؟'' حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: جی ہاں! تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے تمھارے بعد تین مرتبہ ایسے چار کلمات کہے ہیں کہ اگر وہ تمھارے اتنی دیر کے تمام وظائف کے ساتھ تولے جائیں تو وہ ان کے برابر ہو جائیں گے۔'' ان چار کلمات پر مشتمل وہ چھوٹی سی دعا یہ ہے:

((سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ))[2]

اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل سے نوازے۔(آمین)

فرضوں کے بعد دعا کے مختلف انداز:

پنج گانہ فرائض سے سلام پھیرنے کے بعد جو ذکر و اذکار، اوراد و وظائف اور دعائیں ہیں، ان میں سے اذکار و وظائف تو عموماً ہاتھ اٹھائے بغیر ہی کیے جاتے ہیں، اب رہا مسئلہ دعا کا تو ہمارے برصغیر کے ممالک میں اکثر مساجد کے ائمہ سلام پھیرنے کے فوراً بعد ((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ)) ہاتھ اٹھا کر پڑھتے ہیں اور مقتدی بھی اجتماعی طور پر اس دعا میں شریک ہو جاتے ہیں اور آمین آمین کہتے ہیں، پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر بقیہ نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ بعض مساجد میں چند منٹ کے

[1]حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''كان يسبّح بالحصٰى'' لیکن اس کی سند ''واہ جدًّا'' ہے۔(السلسلة الضعيفة 1/ 117) [2] دیکھیں : نيل الأوطار(1/ 2/ 316)السلسلة الضعيفة(1/ 112)تحفة الأحوذي(9/ 458)

لیے اذکار وغیرہ کیے جاتے ہیں اور پھر دعا کی جاتی ہے اور جب تک دعا نہ ہو جائے تب تک مقتدی حضرات اپنے آپ کو امام کی اقتدا سے خارج نہیں سمجھتے۔ یہاں (ان خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں) معاملہ بالکل ہی اس کے برعکس ہے کہ کسی شاذ و نادر مسجد کے سوا عام طور پر مساجد میں فرض نمازوں کا سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی شکل میں دعا کرنے کا کوئی رواج نہیں، جس سے ہمارے لوگوں کو تشویش ہوتی ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اذکار و وظائف اور دعاؤں کے ضمن میں اس موضوع کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ کسی ملک میں کسی

کام کا رواج نہ ہونا کوئی شرعی سند نہیں ہوتا کہ وہ کام ہی جائز نہیں ہوگا۔ بعینہٖ کسی ملک میں کسی کام کا مروّج ہونا بھی شرعی طور پر اس بات کا ثبوت نہیں بن سکتا کہ وہ کام یقیناً مشروع ہی ہوگا، بلکہ احکامِ شریعت کی اصل بنیاد اور معیار کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پہلا انداز:

جہاں تک فرضوں کے بعد دعا کرنے کا تعلق ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً انفرادی طور پر اذکار و وظائف سے فارغ ہو کر بغیر ہاتھ اٹھائے ہی اپنی دنیا و آخرت کے لیے دعائیں کرنا۔ اس میں تو کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ جو جتنی چاہے اور جب تک چاہے دعائیں کرے۔

دوسرا انداز:

دوسری صورت یہ ہے کہ اذکار سے فارغ ہو کر کبھی کبھار دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگی جائے۔ اگر یہ عمل انفرادی طور پر ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے جواز پر امام سیوطی رحمہ اللہ نے مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''فضّ الوعاء في أحاديث رفع اليدين في الدُّعاء'' رکھا ہے۔[1]

شارح مشکوٰۃ علامہ عبید اللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ جن روایات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا ذکر آیا ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک پر کلام کیا گیا ہے، مگر وہ کلام ایسا نہیں کہ ان احادیث پر موضوع یعنی من گھڑت ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ اس لیے ان (روایات) سے امام کے لیے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا جواز یا استحباب ثابت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ چونکہ کسی روایت سے اس طرح دعا کرنے کی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یا امام کے لیے ثابت نہیں، اس لیے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا امام اور مقتدی دونوں کے لیے جائز ہوگا۔[1]

تیسرا انداز:

تیسری صورت ہے اجتماعی دعا کرنا، یعنی امام اور مقتدی سب ہاتھ اٹھائے ہوئے ہوں، امام بلند آواز سے دعا کرتا جائے اور مقتدی آمین آمین کہتے جائیں۔ یہ انداز اگر التزام کے ساتھ نہ ہو، بلکہ بلا التزام کبھی کبھی ایسا کر لیا جائے تو کثیر محققین نے اسے جائز قرار دیا ہے، جس کے جواز کے بارے میں متعدد روایات ملتی ہیں، جنھیں برصغیر کے محدثِ کبیر علامہ عبد الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے ترمذی شریف کی شرح تحفۃ الاحوذی میں نقل کیا ہے اور کئی صفحات پر مشتمل تحقیقی بحث میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔[2]

چوتھا انداز:

اس مروّجہ طرزِ دعا کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اس اجتماعی انداز پر ہمیشگی کی جائے۔ پانچوں وقت فرضوں کے بعد بلاناغہ امام بلند آواز سے دعا کرتا جائے اور مقتدی آمین کہتے جائیں۔ دعا کی اس ہیئت کذائی کو ضروری سمجھ کر اس کا التزام کیا جائے تو اس کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملتا۔ اگر مروّجہ ہیئت پر عہد نبوت میں عمل ہو رہا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جو جم غفیر تھا، ان میں سے کسی سے یہ بات ضرور منقول ہوتی۔ محرک و دواعی نقل موجود ہونے اور مانع کے مرتفع ہونے کے باوجود عدمِ نقل عدم وقوع اور ترک کی دلیل ہے۔ اس کا دعاے قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہوئے پابند ہو جانا، محض قیاس آرائی ہے دلیل نہیں، کیونکہ کسی امر کے بطورِ عبادت مشروع و مسنون ہونے کے لیے خاص و صریح نص کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس مسئلے میں موجود نہیں ہے۔ جو عام روایات اس خاص شکل کے جواز پر بطور استدلال پیش کی جاتی ہیں:

1۔ تو وہ خاص و صریح نہ ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں۔

2۔ ان میں اکثر روایات متکلم فیہ ہیں۔ بلکہ مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے ایک حدیث بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے، جس میں محل شاہد کے الفاظ "رفع یدیہ و دعا" امام سیوطی کے تسامح سے یا کسی کاتب کے سہو سے نص حدیث میں نقل ہو گئے ہیں، ورنہ خود مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ الفاظ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ نیز یہی روایت مصنف ابن ابی شیبہ کے علاوہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد، سنن دار قطنی، بیہقی، صحیح ابن حبان، صحیح ابن السکن، مستدرک حاکم، مسند طیالسی، معرفۃ الصّحابۃ لابن مندہ، اسد الغابۃ، طحاوی اور دارمی میں بھی اسی سند کے ساتھ مذکور ہے، مگر کسی کتاب میں بھی اس روایت میں "رفع یدیہ و دعا" کے الفاظ نہیں پائے جاتے۔[1] اس ہیئت کے جواز پر جو صحیح احادیث روایت کی جاتی ہیں، ان کا تعلق دوسرے اوقات کی ہنگامی دعاؤں سے ہے، جو مروّجہ پنج وقتہ دعا پر فٹ نہیں آتیں۔ مانعین اجتماعی دعا سفر السعادۃ فیروز آبادی، زاد المعاد ابن قیم، سبل السلام امیر صنعانی اور فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جو عبارتیں پیش کرتے ہیں، جن سے مطلقاً انکار مترشح ہوتا ہے، حضرت العلام نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے "دلیل الطالب" میں ان کے مفہوم کی تعیین کرتے ہوئے لکھا ہے: "

مراد نفی دوام ست بہیئت کذائی الیوم"۔ (1/ 323)

"اس نفی سے مراد آج کل کی مروّج اجتماعی دعا پر ہمیشگی کی نفی ہے۔"

"واِلاّ دعاء بعد از فریضہ ثابت ست کما تقدم۔"[2]

"ورنہ فرضوں کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔"

الغرض اجتماعی دعاپر دوام اور اس کا التزام سنت سے ثابت نہیں، بلکہ اقرب الی السنہ انداز یہ ہے کہ کبھی ہاتھ اٹھا کر، کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے، کبھی اجتماعی شکل میں اور کبھی انفرادی طور پر دعا کی جائے اور بالالتزام دعانہ کرنے پر تشویش کا شکار نہ ہوں۔ جو شخص "من حیث الامام" کبھی کبھی ایسا کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی ہے:

"خَيْرُ الْأُمُوْرِ اَوْسَطُهَا"[3] وَفَّقَنَا اللهُ لِكُلِّ خَيْرٍ وَتَقَبَّلَهٗ مِنَّا۔

[1]مشكاة المصابيح(1/ 306 وحسّنه الالباني) [2] مشكاة المصابيح(1/ 306 وحسّنه الالباني)صحيح الترغيب والترهيب(1/ 188)

ابوعطاءالمنعم رضاءالله بن الحاج خان بادشاه حفظه الله ورعاه وجعل الجنة مثواه

22ذوالحجة -1446ھ -بمطابق:18جون--2025

یوم الاربعاء وقت:4--30ظهر

مؤلف کے دیگرتالیفات

(1) كتاب الحجامة پښتو ..... مطبوع
(2) حوارات المسلم عربی ..... مطبوع
(3) حوارات النسوة عربی ..... مطبوع
(4) حوارات ابناءالاسلام ..... غیرمطبوع
(5) حوارات بنات الاسلام عربی ..... مطبوع
(6) حدیقةالمسلم عربی ..... غیرمطبوع
(7) حدیقةالنسوة عربی ..... غیرمطبوع
(8) تذكرة بياد شيخ اردو ..... مطبوع
(9) اتحادالامت پښتو..... مطبوع
(10) معارف الاحوال لاصلاح عمل الاطفال پښتو مطبوع

(11) اسان اصول فقه پښتو ..... غیرمطبوع
(12) لغة الاطفال عربی ..... مطبوع
(13) میزان الصرف عربی ..... مطبوع
(14) صرف بهائی عربی ..... غیرمطبوع
(15) مه غمژن کیګه .... غیرمطبوع
(16) اسلامی نغمے پښتو ..... غیرمطبوع
(17) دعوت الی الله غیرمطبوع
(18) روضة الاطفال مطبوع
(19) پښتو ترجمہ اسان مونځ مطبوع
(20) ماحکم المیراث فی الاسلام مطبوع
(21) اَلْمُکَالَمَةُ بَیْنَ یَدَیکَ غیرمطبوع
(22) اسانه طریقه دقرآن مجیددحفظ مطبوع
(23) علم القرآن غیرمطبوع
(24) اهل القرآن ورجال القرآن غیرمطبوع
(25) پرسکون ګهرانہ اورحقوق نسواں غیرمطبوع
(26) المکالمہ بین النساء غیرمطبوع
(27) ځلویښت دعاګانی اوځلویښت حدیثونہ مطبوع
(28) عظمت قرآن بزبان قرآن غیرمطبوع
(29) الجرح والتعدیل وظوابط التحقیق والتخریج غیرمطبوع
(30) اصول الحدیث فی حدیث الرسول غیرمطبوع
(31) توحید باری تعالٰی سےمتعلقہ شکوک وشبہات کاازالہغیرمطبوع
(32) پښتوترجمہ رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآنِ حکیم غیرمطبوع
(33) پښتو ترجمہ مطالعۂ قرآنِ حکیم جلد اول غیرمطبوع
(34) پښتو ترجمہ مطالعۂ قرآنِ حکیم جلد دویم غیرمطبوع
(35) پښتو ترجمہ خیرالاصول فی حدیث الرسول مطبوع
(36) فتنوں میں مؤمن کاکردار غیرمطبوع
(37) نورالقرآن غیرمطبوع
(38) فکری جنگ غیرمطبوع

(39) اہل السنۃ والجماعۃ کا تصور سنت (39)

(40) جہنم کا بیان اور اللہ سے محبت کیوں اور کیسے

(41) اصول الفقہ فی علوم الفقہ

(42) مؤمن کی نماز اور طہارت کے مسائل واحکام

(43) **نماز کا مسنون طریقہ اوراس کے احکام و مسائل**

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	حرفِ آغاز	2
2	نماز کا مسنون طریقہ اوراس کے احکام و مسائل	5
3	استقبالِ قبلہ	9
4	جنگل یا بلادِ کفر و شرک یا اندھیرا ہونے کی صورت میں:	11
5	ریل گاڑی، بس، کشتی اور بحری و ہوائی جہاز میں استقبالِ قبلہ:	12
6	قیام	14
7	کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز پڑھنے میں فرق:	15
8	سُترہ	16
9	نمازی اور سترے کے مابین فاصلہ:	17
10	کوئی کہاں سے گزرے؟	18

11	نماز میں صف بندی اور پاؤں کی کیفیت	20
12	اِدھر اُدھر جھانکنے پر وعید:	21
13	مسائل و احکام نمازِ جنازہ	22
14	نوحہ خوانی اور سوگ و ماتم :	24
15	احکام الجنائز کی وسعت:	29
16	مریض کی ذمہ داریاں:	30
17	حسنِ خاتمہ کی علامات و نشانیاں:	31
18	خودکشی کی موت:	32
19	خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ؟:	35
20	لاَ اِلٰہَ اِلاَّاللہ کی تلقین:	36
21	میت کو غسل دینا :	37
22	شہید کا حکم :	38
23	بچے کی میّت کو غسل دینا :	39
24	: بیوی کا خاوند کو اور خاوند کا بیوی کو غسل دینا	40
25	شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے کے دلائلِ جواز:	41
26	مانعین کے دلائل اور انکا جائزہ:	42
27	غیر معروف لاش یا چند ٹکڑوں کا حکم :	43
28	غسلِ میّت کا مسنون طریقہ:	45
29	غسلِ میت کے سلسلہ میں بعض فقہی تشریحات:	46
30	مُحرم کا غسل	47
31	کفن کا کپڑا:	48

32	سفید کپڑے کی فضیلت :	49
33	عورت کے کفن کے کپڑے:	50
34	اپنا کفن خود تیار کر کے رکھ لینا:	51
35	مُحرم کا کفن :	52
36	کفن کو خوشبو لگانا:	53
37	راہداری؟:	54
38	راہداری؟:	55
39	میدان، جنازہ گاہ یا مسجد میں جنازہ :	56
40	دو یا تین صفیں بنالینا:	57
41	عید کے دن غسل کا مستحب ہونا	58
42	بہترین کپڑے پہن کر عید کے لیے جانا	59
43	عیدین میں کھانا	61
44	ب: عید الاضحی:	62
45	عید گاہ میں نمازِ عید ادا کرنا	63
46	بچوں کو عید گاہ لے جانا	65
47	تکبیرات پکارتے ہوئے عید گاہ جانا	66
48	تکبیرات کہنے کے اوقاتِ آغاز و اختتام	67
49	ب: عید الاضحی میں تکبیرات کہنے کا وقت آغاز و اختتام:	68
50	تکبیرات کے الفاظ	69
51	تکبیرات کون کہے؟	70

52	نمازِ عیدین کا حکم	71
53	نمازِ عیدین کا وقت	74
54	نمازِ عیدین سے پہلے اذان و اقامت اور کوئی ندا نہیں	75
55	عید گاہ میں سترے کا اہتمام کرنا	78
56	نمازِ عید کی رکعتیں	79
57	تکبیراتِ زائدہ کے ساتھ رفع الیدین	80
58	تکبیراتِ زائدہ کے درمیان وقفہ اور ذکر	81
59	نمازِ عید کی دو رکعتوں میں قرأت	82
60	نمازِ عید کا خطبہ سے پہلے ہونا	83
61	خطبہ عید میں خواتین کو وعظ و نصیحت	86
62	عید کی مبارک باد	88
63	نمازِ عید سے پہلے یا بعد نفلی نماز نہ ہونا	89
64	چاند کی خبر روزِ عید آنے پر نمازِ عید کا وقت	91
65	نمازِ عید ادا نہ کر سکنے والے شخص کی نماز	92
66	عیدین کے دونوں دنوں میں روزہ کی ممانعت	94
67	شرائع قدیمہ اور نماز، قرآن کریم میں	95
68	2 اوصافِ حضرت اسماعیل علیہ السلام:	96
69	6 حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وصیتِ الٰہی:	97
70	4۔ نماز کے لیے اذان و اقامت، قرآن کریم میں	99
71	۔ تعمیر مساجد، قرآن کریم میں	101

72	3 دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر "اللہ" کا:	102
73	نماز کے لیے ضروری لباس	103
74	مَردوں کے لیے ریشم کا لباس:	106
75	عورتوں کے لیے ریشم اور سونے کی اجازت:	108
76	ریشم ملا کپڑا:	109
77	ریشم کی جائز مقدار:	111
78	ریشم کے بچھونے:	113
79	نماز میں ستر عورہ :	116
80	مَردوں کا مقامِ ستر:	118
81	رانوں کو مقامِ ستر کہنے والوں کے دلائل:	119
82	نمازِ قصر	120
83	سفر میں سہولتیں:	121
84	نماز قصر کے دلائل:	122
85	قصر کی رکعتیں:	123
86	قصر۔۔۔واجب ہے یا جائز؟	124
87	قصر کی مسافت:	126
88	جمہور ائمہ کا مسلک:	127
89	کیفیتِ سفر:	128
90	مجبور کے لیے حکم:	129
91	سفر میں سنن و نوافل:	130

92	عام نفل نمازیں:	131
93	صلاۃ الخوف	133
94	"صلاۃ الخوف" کی مختلف انواع و اشکال اور طریقے:	134
95	ایک وضاحت:	135
96	پہلا طریقہ:	136
97	تیسرا طریقہ:	137
98	پانچواں طریقہ:	138
99	خوف میں نمازِ مغرب ادا کرنے کے طریقے:	139
100	گھمسان کی جنگ اور دست بدست لڑائی میں نماز؟	141
101	اوقاتِ قبولیت، آدابِ دعا اور شرائطِ قبولیت	142
102	آداب و شرائطِ قبولیت	143
103	دعاؤں اور اذکار کا وقت:	144
104	دعائیں اور اذکار:	145
105	7 تسبیح:	147
106	دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر تسبیح وغیرہ:	150
107	تسبیح کا استعمال؟	154
108	کچھ اور اَذکار:	156
109	فرضوں کے بعد دعا کے مختلف انداز:	159
110	تیسرا انداز:	160
111	مؤلف کے دیگر تالیفات	162
112	فہرست	164